



کتاب
وقت

کشی وکت جہانیا



کتاب
کشی
وکت
جہانیا

ترتیب

- ۱۔ پہلی بات۔ ۵
- ۲۔ کش دیو اور میر پری۔ ۷
- ۳۔ من کی جوت۔ ۱۱
- ۴۔ حرار شریف کے ریشی بابا۔ ۱۵
- ۵۔ خواجہ محمد کے انڈے۔ ۱۹
- ۶۔ قدیم کہانی غنی بابا کی زبانی۔ ۲۵
- ۷۔ اخوند ملا کی کہانی۔ ۲۷
- ۸۔ سلطان مسعود غزنوی اور مجیر (منظوم)۔ ۳۹
- ۹۔ راجہ کی کہانی۔ ۴۱
- ۱۰۔ پتھروں کی بارش۔ ۵۱
- ۱۱۔ بھدر واہ۔ ۵۵
- ۱۲۔ ایک سنار۔ ۵۹
- ۱۳۔ بالنہری۔ ۶۷
- ۱۴۔ اکلوتا بیٹا۔ ۷۱
- ۱۵۔ در درستان۔ ۷۵
- ۱۶۔ موزل ہامہ کا خوبہ۔ ۷۷
- ۱۷۔ سورنے کی کان۔ ۸۰

- ۸۵۔ یوسف زلیخا۔
- ۸۹۔ پانٹہ چھوکھ کی بیٹیاں۔
- ۹۳۔ ابر بادشاہ۔
- ۹۷۔ سوداگر کی کہانی۔
- ۱۰۳۔ پیہ مال اور ناگ رائے۔
- ۱۰۹۔ لالہ ملک کا گیت۔
- ۱۱۱۔ طوطا کہانی۔
- ۱۱۷۔ کسان کی بیوی اور شہید کی مکھی۔
- ۱۲۱۔ ایک گیت۔
- ۱۲۵۔ دردستان کے شہزادے۔
- ۱۲۹۔ کالا چور۔

پہلی بات

اردو میں کشمیری لوک کہانیوں کی یہ پہلی کتاب ہے۔ لوک ورثہ کے قومی ادارے نے کشمیری لوک کہانیوں کو جمع کرنے کا کام چند سال پہلے شروع کیا تھا۔ طاؤس بانہالی نے گاؤں گاؤں گھوم کر یہ کہانیاں عام لوگوں سے سنیں اور انہیں عام سیدھے سادے اور کہانی سننے کے انداز میں تحریر کیا۔ یہ سب کہانیاں کشمیری عوام میں مقبول ہیں اور دلچسپی سے سنی جاتی ہیں لیکن یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اب کہانیاں سننے اور سننے کا رواج آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔

قدیم دور کے کشمیر میں داستان گوئی کی روایت بڑی توانا اور باندار تھی یہاں تک کہ کشمیری بھاٹ اور راس دھاریے بھی نقلیں کرنے کے ساتھ ساتھ لوک کہانیاں اور داستانیں لگا کر سناتے اور ڈرانے کے انداز میں پیش کیا کرتے تھے۔ صرف کشمیر میں ہی نہیں بلکہ سرحدوں کے موسم میں یہ لوگ گرم علاقوں کی طرف آجاتے اور اپنے فن سے لوگوں کے دل جیت لیا کرتے تھے۔ یہ داستان گو ایک ادارے (INSTITUTION) کی حیثیت رکھتے تھے اور انہیں کہانی سننے کے فن میں کمال حاصل تھا۔ آج کل آزاد کشمیر میں بہت کم گاؤں ایسے ہیں جہاں داستان گو خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد رہائش پذیر ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ چکے ہیں اور منمت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ کچھ زیر تسمیرہ عمارتوں کے لئے اینٹیں اٹھاتے ہیں۔ کچھ اپنا گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آگئے ہیں اور ہسٹلوں

میں کام کرتے ہیں جو اپنے گاؤں میں رہتے ہیں وہ بیدار دوسرے درختوں کی لچیلی شاخوں سے
 کانگریاں، ٹوکریاں اور دوسری چیزیں تیار کرتے ہیں اور اسی مناسبت سے انہیں "شاخسار"
 کہا جاتا ہے۔ مگر اب بھی جہاں کہیں کوئی شادی ہوتی ہے یہ لوگ شہنائیاں بجاتے ہیں اور رات
 کو محفل جمتی ہے تو ان سے کہانی سننے کی فرمائش کی جاتی ہے اور وہ وچار ڈال کر منظوم
 کہانیاں اور داستانیں گا کر سناتے ہیں۔

کشمیری داستان گوئی کی تاریخ میں سب سے بڑا نام حاتم تیلی کا ہے۔ حاتم تیلی نے پہلی
 جنگ عظیم کے زمانے میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے اس وقت اس کی عمر اسی برس کے لگ بھگ
 تھی۔ آزاد کشمیر میں اب تک بیشتر کہانیاں حاتم تیلی کے حوالے سے ہی سنی اور سنائی جاتی ہیں
 دراصل حاتم تیلی ایک روایت ہے اور اس کتاب میں شامل بیشتر کہانیاں بھی اسی کی سنائی ہوئی
 ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔

ان کہانیوں کے ذریعے ابتداء سے لے کر آج تک کشمیر میں اہم مذہبی تبدیلیوں اور مختلف
 قوموں کے تہذیبی رویوں اور اعتقادات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مختلف اعتقادات کا اڈا اور مذہبی
 تضاد دراصل اسلامی تہذیب کے ظہور کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں
 سے اس *OLD WISDOM* کا اندازہ بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے لوگ بڑے سے بڑے
 مسائل آسانی سے حل کر لیا کرتے تھے۔ یہ کہانیاں عام لوگوں اور *SOCIAL SCIENCES* کے
 طالب علموں کے لئے مفید اور رہنما ثابت ہوں گی۔

منظر الاسلام۔

کش دیو اور میر پری

روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں اُن کے ایک فرماں بردار دیو نے اپنی خدمات کا صلہ یوں چاہا کہ اُسے ایک پری کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس دیو کا نام کش تھا اور اس کی حسین محبوبہ میر پری کہلاتی تھی۔ ان دونوں نے کوہ سلیمان کو عبور کر کے وادی میں قدم رکھا اور سلیمان کی چوٹی یا تخت سلیمان کو اپنا مسکن بنایا۔ جہاں اب سرینگر کا شہر آباد ہے۔ کش اور میر کے اسی جوڑے کے ناموں کی نسبت سے اُردھ کی جھیل کا نام کشتیر مشہور ہوا۔ لیکن اُردھ نے حضرت سلیمان کے ان دونوں نام لیواؤں کو کبھی بھی چین سے نہیں رہنے دیا.... کش دیو اور میر پری اس اُردھ سے بہت نالاں تھے اور انہوں نے خدا سے دُعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان کے صدقے اس اُردھ کو فنا کر دے.... ایک دن دعا کرتے کرتے دونوں کی آنکھ لگی تو خواب میں ایک غیبی آواز سنائی دی کہ ایک بزرگ اُردھ کی وادی میں آکر اُسے رام کرے گا.... پھر یوں ہوا کہ اچانک اُردھ غائب ہو گیا۔ کش دیو اور میر پری نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ کی اونچی چوٹی پر گھنے جنگل میں ایک

بزرگ بیٹھے عبادت کر رہے ہیں اور اژدھا موم ہو کر ان کے قدموں میں سر جھکائے بیٹھا ہے

بزرگ نے اژدھے کو حکم دیا کہ وہ حضرت سلیمان کے ان نام لیواؤں کو وادی میں رہنے کی جگہ دے لیکن اژدھا بولا کہ حضور میں تو فقط آپ کا خادم ہوں کہ آپ اشرف المخلوقات ہیں۔ آپ میرے ساتھ چل کر جہاں بھی چاہیں قیام فرما بیٹے، میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ تب ان بزرگوار نے کشتی اور میر سے کہا کہ وہ اسی جنگل میں قیام کریں اور کل صبح یا شام کے وقت پہاڑ کی اونچی چوٹی سے وہ منظر دیکھیں جو انہیں تخت سلیمان یعنی موجودہ سرینگر میں یہاں سے صاف دکھائی دے گا۔ یہ کہہ کر وہ بزرگ اژدھے کی پیٹھ پر سوار ہو کر سرینگر کی طرف چل دیئے۔ اژدھے نے کہا کہ حضور اگر آپ ساری عمر یونہی میری پیٹھ پر گزار دیں تو یہ میرے لئے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ روحانی بزرگ نے کہا کہ میرے پاؤں مٹی پر ہونے چاہئیں کیوں کہ میں اُسی صفت میں اپنی عبادت کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہوں۔ اژدھے نے اپنی دم کو پانی پر زور سے مارا اور اُس جگہ کی زمین خشک ہو گئی۔ انہوں نے یہاں پر صبح کی نماز ادا کی اور دُعا مانگنے میں مصروف ہو گئے۔

پہاڑ کی چوٹی سے کشتی دلو اور میر پری یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے، کیا دیکھتے ہیں کہ ان بزرگ کی روحانی قوت سے جیسے اُن کا جسم بھی پھیلتا جا رہا ہے اور اژدھا اپنی پوری قوت سے پانی کو دھکیلتے ہوئے پیچھے کی طرف کھسک رہا ہے دیکھتے ہی دیکھتے جھیل خشک ہونے لگی۔

اژدھے نے درخواست کی کہ حضور مجھے بھی اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ جواب ملا کہ ہاں تم یہاں سے کچھ پرے فلاں جھیل میں رہ سکتے ہو۔ لیکن پہاڑوں اور جنگلوں پر بھی تمہارا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ اور جب تک ہمارے پانچسو

نام لیا بھی اس سرزمین پر باقی رہیں گے تم اس وادی کو دوبارہ جھیل میں نہیں بدل
 سکتے۔ اس کے بعد پانچ سو ہزرگوں کا ایک قافلہ آیا۔ اور انہوں نے وادی
 میں ڈیرے ڈالے۔ پھر قدم قدم پر بستیاں بستی رہیں لیکن اڑدھا اپنی جھیل سے باہر
 نہ نکلا اور نہ کبھی اُس کی اولاد نے انسانوں کو تنگ کیا۔
 کہا جاتا ہے کہ چشموں میں پائی جانے والی مچھلیاں بھی اسی اڑدھے کی اولاد
 ہیں۔ اسی لئے چشمے کی مچھلی کا شکار بھی ہم لوگوں پر حرام ہے۔

من کی جوت

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کشمیر پر ترک مہاراجوں کا راج تھا اور مہاراجہ کا مذہب عام لوگوں سے مختلف تھا..... مہاراجہ کا ایک وزیر حکمران سے بہت متاثر ہوا، اور اُس نے وہی مذہب اختیار کیا، اس بات پر وزیر کا بیٹا اپنے باپ سے بہت ناراض تھا اور وہ بات بات پر اپنے باپ کو ٹوکتا تھا۔ وزیر کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیوں کر اپنے بیٹے کو سمجھائے کہ ہر مذہب سچائی کی تلقین کرتا ہے، بات صرف اس پر عمل کرنے والوں کے اعمال کی ہے کہ وہ پیار محبت کا رویہ اختیار کرتے ہیں یا نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ ایک دن اکلوتے بیٹے نے اپنے باپ کو یہ دھمکی دی کہ اگر اُس نے ترک حکمران کا مذہب ترک نہ کیا تو وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا۔ وزیر بہت پریشان ہوا، اور اُس نے اپنی اس پریشانی کا اظہار بادشاہ کے سامنے کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ تم اپنے بیٹے کو میرے سپرد کر دو اور یہ کہہ کر دو سواروں کو حکم دیا کہ وزیر کے بیٹے کو گرفتار کیا جائے۔ پیادے اُسے گرفتار کر کے لائے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ یہ سن کر وزیر زادہ بادشاہ کے پاؤں پڑا اور

اس کا باپ بھی منت سماجت کرنے لگا کہ ”اس کی جان بخشی کیجئے، مجھے یقین ہے کہ اب یہ سیدھی راہ پرائے گا۔“ بادشاہ نے کہا کہ میں تمہیں ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں، اگر ایک مہینے میں تمہارا بیٹا سیدھی راہ پر آیا تو اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔

ایک ماہ کا عرصہ گزرنے پر دونوں باپ بیٹے بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے، تو بیٹے کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ وہ بادشاہ کے پاؤں پڑا، اور کہنے لگا کہ مجھے اپنی جان پیاری نہیں لیکن خدا کے لئے میرا وہ جرم بتا دیجئے جس کی وجہ سے مجھے موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ اس ناکردہ گناہ پر موت کی سزا ملنے کے معاملے میں سوچتے سوچتے میری نیند حرام ہو گئی ہے، حالانکہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ برخوردار میں تمہیں موت کے خوف کا نظارہ کروانا چاہتا تھا۔ اب تم پر یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ موت کا خوف موت سے زیادہ اذیت کا باعث ہوتا ہے؟ کیا تم اس خوف سے نجات پانے کے لئے ایسا مذہب اختیار کرنا چاہو گے جو اذیت کے اس زہریلے درخت کو جڑ سے اکھاڑ دے؟ وزیر زادے نے کہا کہ میں یقیناً اس خوف سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن جو مذہب مجھے اس سے نجات دے سکتا ہے۔ اُس کی تفصیل سے آگاہ ہونا بھی میرے لئے فردری ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس تفصیل سے آگاہ ہونے کے لئے تمہیں کچھ دن میرا مہمان بن کر رہنا ہوگا اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ وزیر زادے کو شاہی محل کے مہمان خانے میں رکھا جائے۔

ایک ٹھیک شام کو بادشاہ نے ایک جلیبی ہوئی شمع یہ کہہ کر وزیر زادے کے ہاتھ میں تھادی کہ یہ شمع ہاتھ میں لے کر تمہیں شاہی محل سے اپنے گھر تک سرپٹ بھاگنا ہوگا اور تم اُلٹے پاؤں دوڑ کر واپس آ جاؤ گے۔ اس دوران میں اگر یہ شمع راستے میں ہوا سے بجھ گئی تو تمہاری زندگی کا چوراغ بھی نکل کر دیا جائے گا۔ حکم عام مرگِ مفاجا۔

کے مصداق وزیر زادے نے کانپتے ہاتھوں سے شمع کو تھاما اور اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ دو پہر پیدار اُس کا اس غرض سے تعاقب کر رہے تھے کہ کہیں وزیر زادہ راہ میں ادھر ادھر نہ دیکھے یا ٹھہر کر کسی سے بات نہ کر پائے۔ جو نہی وزیر نے اپنے بیٹے کو گھر کی طرف آتے دیکھا تو وہ بیٹے سے ملنے کو آگے بڑھا لیکن بیٹا چلا کر بولا کہ ابا جان مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔ اگر میں اُٹے پاؤں بھاگ کر محل میں جلتی ہوئی شمع لے کر واپس نہ پہنچ سکا تو میری گردن اُڑا دی جائے گی۔ یہ کہہ کر وزیر زادہ واپس محل تک پہنچا اور محترم بت بن کر حکمران کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وزیر زادے کو یوں بے حس و حرکت دیکھ کر بادشاہ نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔ ”کہو سفر کیسا رہا اور کس کس سے ملاقات ہوئی؟“ وزیر زادہ بولا کہ ”سرکار مجھے شمع کے بجھنے کا اتنا خوف تھا کہ آنے جانے کی کیفیت یا ارد گرد کے ماحول کا کوئی ہوش ہی نہ رہا۔“ شاہاش۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”یہی سبق سکھانے کے لئے میں نے تمہیں چراغ لے کر ہوا کے سامنے روانہ کیا تھا کہ تمہاری نظر صرف شمع پر مرکوز رہے اور تم گرد و پیش کے ماحول سے بے نیاز ہو جاؤ۔ یہی سبق مجھے میرے مذہب نے سکھایا ہے۔ میرا مذہب مجھے خوف سے بے نیاز ہو کر ایک ازلی اور ابدی سچائی پر اس طرح دھیان دینے کی تلقین کرتا ہے کہ میں دنیا کے باقی دکھوں اور سکھوں سے بے نیاز ہو جاؤں۔“ وزیر زادہ بادشاہ کے اس علی مظاہرے سے اتنا متاثرہ ہوا کہ اُس نے بادشاہ کے قدموں میں گر کر اُسے اپنا ہم مذہب بنانے کی درخواست کی۔ یوں باپ بیٹے کا جھگڑا بھی مٹا اور وزیر زادہ دنیا کے دوسرے جھگڑوں سے بھی آزاد ہو گیا۔

راوی کہتا ہے کہ ایسے ہی موقع پر کشمیر میں لوگ لالہ دیدی کا یہ اشلوک گاتے ہیں۔

یوں مل پائے نہ من کا چین
چھوڑ بھی دے یہ گیدڑ بین

روتے روتے جیون جائے
مگن ہو من کی جوت جگائے

حرار شریف کے ریشی بابا

کشمیر کی مختلف زیارتوں کے مجاور صدیوں سے نذر نیاز وصول کر کے خوشحال زندگی گزارنے چلے آئے ہیں۔

اچھے اور بُرے لوگ کہاں نہیں ہوتے لیکن ان مجاوروں میں اگر کوئی بُرا آدمی بھی ہو تو اُسے اُس کی برائیوں کے باوجود اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک مجاور کی کہانی چرار شریف کی درگاہ سے وابستہ ہے۔

روایت ہے کہ چرار شریف کی درگاہ کے ایک مجاور صاحب بھولے بھالے لوگوں کو ٹوٹنے کے فن میں بہت ماہر تھے۔ ایک روز کسی گاؤں کا ایک دولت مند آدمی اُن کے پاس آیا، جو اولاد کی دولت سے محروم تھا۔ اس دولت مند آدمی نے مجاور کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھتے ہوئے کہا کہ ریشی بابا تم جو ہمیشہ آتے جاتے مجھ سے نذرانہ وصول کرتے ہو کبھی تو میرے حق میں اولاد کی دولت کے لئے بھی دعا کرو۔

ریشی بابا بولے کہ خواجہ صاحب ایک روپے میں تو صرف شیرینی ملے گی، ہاں ایک سو روپیہ نذر کرو، تو انشاء اللہ بیٹے کی آرزو بھی پوری ہوگی۔ نہ جانے کون سی عادت

حق کو خواجہ صاحب نے تھیلی کا منہ کھول کر ریشی بابا کو ایک سو روپے نذر کئے اور درگاہ کی جالی پکڑ کر ٹوٹے دل کے ساتھ زار و قطار رونے لگا۔ ریشی بابا یہ حالت دیکھ کر خود بھی رو پڑے اور انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اگر اللہ میاں اس آدمی کو اولاد دے تو میں ایک سو روپے کی اس نذر کا چوتھا حصہ اللہ کے نام پر خیرات کروں گا۔

شام کو ریشی بابا اپنے گھر جانے لگا تو راستے میں تین اندھے بھکاریوں کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ ریشی بابا کا جی چاہا کہ دولت مند آدمی کی نذر کا چوتھا حصہ ان ہی مستحق بھکاریوں میں بانٹ دے لیکن پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ ان بھکاریوں سے اُن کا نام پتہ پوچھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ یہ تینوں بھکاری اُسی گاؤں کے رہنے والے ہیں جو اولاد کی بھیک مانگنے والے دولت مند کی جاگیر ہے۔ ریشی بابا نے ان اندھے بھکاریوں سے پوچھا کہ کیا اُس گاؤں کا مالک اُن کے لئے کسی مستقل روزگار کا بندوبست نہیں کرتا؟ تینوں بھکاری بولے کہ ”بابا اُس ظالم کی آنکھوں پر تو دولت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اسی لئے تو شاید اللہ میاں نے اُسے اولاد کی دولت سے محروم رکھا ہے.....“

ریشی بابا نے نذرانے کی تھیلی کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اندھے بھکاریوں کو ایسی خیال آرائی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں دوسروں کے بارے میں ایسے فتوے لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ خدا جانے وہ آدمی جسے ہم برا کہتے ہیں کو کئی نیکی کا پتلا ثابت ہو، پس ہمیں چاہیے کہ کسی کا بُرا نہ چاہئیں۔ کیا معلوم کہ وہ آدمی صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے مردمِ سبزار دکھائی دیتا ہو۔ آؤ ہم چاروں مل کر دعا کریں کہ اللہ میاں تمہارے گاؤں کے مالک کو اولاد کی دولت سے مالا مال کرے..... اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا سُن لی تو میں خود تمہارے گاؤں آکر خواجہ صاحب سے تمہارے لئے کسی مستقل روزگار کا بندوبست کرنے کو کہوں گا۔

یہ کہہ کر ریشی بابا نے تینوں اندھوں کو ایک مسجد میں بٹھا کر تھیلی میں سے پچیس روپے

نکالتے ہوئے کہا کہ یہ رقم تم تینوں بھائی آپس میں بانٹ لو۔

اس سے پہلے کہ ریشی بابا اپنی بات ختم کرتا، تینوں اندھے اُس پر جھپٹ پڑے اور چیخ چیخ کر انصاف کی دھائی دینے لگے۔ گاؤں والے شور مچ کر مسجد کی طرف بھاگے تو ریشی بابا کو تین اندھوں کے درمیان بگڑا ہوا پایا۔ اندھے بھکاری کہہ رہے تھے کہ ریشی بابا ہم سے ہماری ساری پونجی چھیننا چاہتا تھا اور ریشی بابا کی بدحواسی سے گاؤں کے لوگوں کو اس بات کا یقین آگیا کہ وہ ان اندھے بھکاریوں کو ٹوٹنا چاہتا تھا۔ گاؤں والے اندھوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے اور ریشی بابا کو لوگوں کی نظروں میں نفرت اور حقارت کی تحریر صاف نظر آ رہی تھی۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے کوئی ایک سال کا عرصہ ہو گیا اور لوگ اسے بھول بھی گئے۔ لیکن ریشی بابا کا دل انتقام کی آگ میں جلتا رہا۔ ایک دن ریشی بابا کو دو متمند آدمی کا یہ پیغام ملا کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے اولاد کی دولت سے نوازا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ریشی بابا خوشی کی اس تقریب میں شرکت فرمائیں۔

ریشی بابا دولت مند آدمی کے گاؤں گئے اور مندر نیاز سے بھری ہوئی تھیلی لے کر واپس آئے۔ راستے میں انہیں پھر اندھے بھکاریوں سے انتقام لینے کا وعدہ یاد آیا، اور انہوں نے واپس جا کر اندھے بھکاریوں کا ٹھکانہ معلوم کر لیا۔ یہ تینوں اندھے بھکاری گاؤں کے سرے پر ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتے تھے۔ ریشی بابا نے اس مکان میں داخل ہو کر خالص دیہاتی لہجے میں آواز دے کر کہا کہ ”اے اندھے بھکاریو! یہ خیرات کی رقم لے لو اور جاگیر دار صاحب کے نوموود بیٹے کے حق میں دعا کرو، یہ کہہ کر ریشی بابا نے نقدی کا تھیلہ بھکاریوں کی طرف پھینکا اور خود بظاہر واپس چلا گیا۔ لیکن وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑا بھکاریوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک بھکاری تھیلی کو کھول کر رقم گننے لگا۔ دوسرے آدمی نے قہقہہ لگا کر کہا کہ آج پورا شریف کے ریشی بابا بھی کہیں سے نکل آتے

تو شاید ہماری رقم دو گنی کر دیتے..... تیسرا اندھا جو نما نہ پڑھ رہا تھا، سلام پھیر کر بولا
 کہ یہ رقم بھی میرے پیرھن (اُونی چوغہ) میں رکھو..... یہ کہہ کر اس نے اپنا چوغہ دو
 اندھوں کی طرف پھینکا۔ اب ریشی بابا سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے لپک کر
 ایک ہاتھ چوغے پر مارا، اور دوسرے ہاتھ سے دونوں اندھوں کے درمیان پٹری ہوئی پتیلی
 اٹھالی۔

ریشی بابا تیزی سے باہر آئے لیکن ابھی شاید اُن کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں
 ہوئی تھی۔ وہ پلٹ کر ٹوٹے پھوٹے مکان کے دروازے تک گئے اور چلا کر بولے.....
 اندھے بھکاریو! یہ رستم مجھ پر حلال ہے، کیونکہ تم نے میری حلال رقم کو نہ صرف حرام
 بنایا بلکہ مجھے میرے گاؤں کے لوگوں کی نظروں میں ٹیڑھا بھی ثابت کیا..... یہ کہہ کر ریشی بابا
 تینوں اندھوں کو جھپٹتے چلاتے چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ اس کے بعد اندھے
 بھکاریوں نے کبھی بھی چسپلا شریف آنے کی جسارت نہیں کی، اور ریشی بابا مدتوں تک
 یہ داستان بڑے فخر سے گاؤں والوں کو سناتے رہے۔

خواجہ محمد کے اندے

محمد ایک معمولی سا کشمیری دیہاتی نوجوان تھا، جس کے ماں باپ لڑکپن میں ہی مر گئے تھے۔ تھوڑی سی زمین جو ماں باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی، اُس قرضے کا سود چکانے کی نذر ہو گئی، جو اُس کے والدین کی تجہیز و تکفین پر گاؤں کے ساہوکار سے حاصل کیا گیا تھا۔ گھر میں کوئی ایسی جائیداد بھی نہ تھی، لے دے کے کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن تھے، جو ایک ایک کر کے ہمسایوں کے گھر پہنچ گئے، آخر میں صرف ایک کٹورا باقی بچ گیا، جو محمد کی شخصیت کا حصہ بن گیا، اور اُسے تک لوگ اُسے محمد کٹورا کے نام سے پکارتے رہے۔ ہوتا یوں تھا کہ کوئی ہمسایہ عورت محمد کو اپنے گھر سے گزرتا دیکھ کر آواز دیتی: ”ارے محمد، ذرا اپنا کٹورا لے کر آنا، تجھے رات کا سچا ہوا سالن دے دوں۔۔۔۔۔ کوئی دوسری عورت کھڑکی سے آواز دیتی: ”محمد ذرا اپنا کٹورا لے آ، تھوڑی سی چائے پڑی ہے پیلیے میں۔۔۔۔۔ یوں وہ محمد کٹورا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کبھی کبھار محمد کو اس نام سے وحشت ہونے لگتی، اور وہ گھنٹوں سوچتا کہ یہ نام کس طرح گاؤں والوں کے ذہن سے محو ہو جائے۔ لیکن کوئی تدبیر نہ سوچتی۔ آخر محمد نے اپنے

دل پر جبر کر کے گاؤں کے مقدم یا نمبردار کے گھر میں نوکری کر لی تاکہ لوگ اُسے مقدموں کا محمود، کہہ کر بچاویں، لیکن کٹورا اُس کے نام کا ایک حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ تنگ آکر محمود نے کسی دوسرے گاؤں جانے کی تدبیر سوچی، لیکن ابھی وہ اُس گاؤں میں جا کر حالات کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اپنے گاؤں کے کسی جاننے والے کا سامنا ہوا اور وہ دُور سے بچا رہا۔ "ارے بھئی محمود کٹورے تو کہاں گھوم رہا ہے۔"

کٹورے کا عجیب و غریب لفظ راہ چلتے بچوں نے سُن لیا تو اُن کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کٹورے کی گردان شروع کر دی۔ محمود وہاں سے بھی ناکام لوٹا اور اپنے کٹورے کو لے کر قصبے کی طرف چل پڑا۔ بازار میں ٹھٹھکیاے کی ایک دکان کو دیکھ کر وہ دکاندار کے پاس گیا اور اپنا کٹورا بیچنے کی خواہش ظاہر کی۔ دکاندار نے کٹورے کا وزن کر کے ایک روپیہ محمود کے ہاتھ میں تھما دیا، اور محمود خوش خوش دکان سے اُٹھ آیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان پیسوں سے محمود کون سا کاروبار شروع کرے..... بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ گاؤں سے اُٹے خرید کر بازار میں بیچا کر بیگا اور یوں محنت کر کے ایک دن امیر آدمی بن جائے گا، تاکہ کسی کو اُسے محمود کٹورا کہنے کی جرات نہ ہو۔

یہ سوچ کر محمود گاؤں کی طرف چل دیا اور اُنڈوں کے کاروبار میں مصروف ہوا۔ اُسے سب سے پہلے ایک بیوہ کا گھر نظر آیا، اور اُس نے ہانک لگائی۔ "اُٹے بیچو۔" گھر سے کوئی آواز نہ آئی تو محمود نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ خالہ کوئی اُٹے ہیں؟ — بڑھیا بولی کہ محمود بیٹے میرے پاس تو ایک مرغی ہے اور وہ بھی کڑک — دیکھتی ہوں شاید کہیں ہانڈی میں کوئی اُٹا پڑا ہو — یہ کہہ کر بڑھیا کو کھڑکی میں سے ایک ہانڈی اُٹھا لائی جس میں دو اُٹے پڑے ہوئے تھے۔ محمود نے قیمت چکانے کا ارادہ کیا تو بڑھیا بولی کہ بیٹا! تم تو میرے اپنے ہو، کیا بھوتہمہاری ماں مر گئی ہے، میں غریب مزدوروں

لیکن ایسا بھی کیا کہ تم سے انڈوں کی قیمت وصول کر لوں بڑھیا کی شفقت دیکھ کر محمدو کی آنکھوں میں آنسو بھرا اُٹے اور اُس نے دونوں انڈے جیب میں رکھتے ہوئے ایک روپے کا سکہ نکالا اور بڑھیا سے کہا کہ وہ یہ پیسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھے۔ بڑھیا نے محمدو کی امانت کو اسی ہنڈیا میں رکھا جس میں انڈے رکھے ہوئے تھے، اور محمدو سلام کہہ کر رخصت ہوا۔

راستے میں محمدو کو یوں ہی خیال آیا اور اس نے دو تین گھروں میں جا کر بڑی بڑھیل کو سلام کیا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد تان آفرانڈے پر ٹوٹی اور محمدو ایک انڈے کی فرمائش کرتا — شام تک محمدو کے پاس پانچ انڈے جمع ہو چکے تھے — اب محمدو اپنی گٹیا میں آکر زبانی جمع خرچ میں مشغول ہوا ”فرض کریں کہ یہ پانچ انڈے مجھ کو چار آنے میں ملے ہیں، اگر میں انہیں ایک آنے کے حساب سے بیچوں تو مجھے کتنا منافع ہوگا؟“ — ساری رات اسی حساب کتاب میں کٹی اور صبح سویرے محمدو بازار کی طرف روانہ ہوا — بازار کے پہلے ہی سرے پر ایک حلوائی کی دکان نظر آئی اور محمدو نے چوڑں جیسی گھبراہٹ والے لہجے میں پوچھا کہ ”لالہ اگر میں نے پانچ کے حساب سے انڈے خریدے ہوں تو کس حساب سے بیچوں؟“ دکاندار بھانپ گیا کہ اسامی کیسی ہے۔ کہنے لگا۔ بھائی ایسے سودا نہیں ہوتا۔ آرام سے بیٹھ جاؤ تو حساب کر کے بتاؤں

کچھ دیر بعد دکاندار بولا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ انڈے تم نے خریدے نہیں ہیں، خیر یہ تمہاری گور گردن جانے، بہر حال اگر تم نے یہ پانچ انڈے چار آنے کے خریدے ہیں تو یہ پانچوں انڈے تم تین آنے میں بیچو گے تو تب جا کر کہیں تمہیں ایک آنے کا فائدہ ہوگا۔ محمدو نے حامی بھری اور تین آنے لے کر رخصت ہوا جاتے ہوئے حلوائی نے آواز دی کہ دیکھو میاں، اگر تم ایک روپے کے گیارہ انڈے خریدو، تو ہم تمہیں ایک

روپیہ فی درجن دے دیں گے یعنی خرید و گیارہ بیچو روپے کے بارہ.....“

محمد مطمئن ہو کر چلا آیا، اور سیدھا گاؤں کی بیوہ عورت کے گھر پہنچ گیا، اُس نے تین آنے کی کمائی بیوہ کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا کہ خالہ! تم مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھتیں؟ — بڑھیا بولی کہ بیٹا شوق سے رہو، اور یوں محمد اس بیوہ کے گھر میں رہنے لگا، جو اُسے کٹورا کھنے کے بدلے صرف محمد کے نام سے پکارتی تھی۔ اتفاق سے بڑھیا کی مرغی پھرانڈے دینے لگی تو محمد نے اُسے بازار کے بھاؤ سے آگاہ کیا۔ بڑھیا سمجھ گئی کہ محمد کسی گھاگ دکاندار کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اُس نے بڑی مشکل سے محمد کو سمجھایا کہ بیٹا انڈے بیچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہی انڈے اگر مرغی سے کی تو اتنے چوزے نکلیں گے اور یہی چوزے بڑے ہو کر اتنے پیسوں میں بک جائیں گے..... ہر چند کہ محمد پہلے پہل ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن بڑھیا کے سمجھانے سے آہستہ آہستہ اُس میں کچھ سمجھ بوجھ پیدا ہونے لگی..... ایک دن بڑھیا محمد کو ساتھ لے کر بازار گئی اور ایک خدا ترس دکاندار سے مرغیوں اور انڈوں کے سودے کی بات طے کر آئی۔

اب محمد کا کام یہ تھا کہ وہ انڈے یا مرغیاں لے کر اس دکاندار کے پاس جاتا اور پیسے لاکر بڑھیا کے حوالے کر دیتا۔ گاؤں کے لوگوں سے اس نے ملنا جھگڑائیوں چھیڑ دیا تھا کہ یہ لوگ اُسے اب بھی محمد کو کٹورا کہہ کر پکارتے، جب کہ بڑھیا اُسے پیار سے اب خوجہ محمد کہہ کر پکارتی تھی اور دکاندار بھی اُسے خوجہ محمد وہی کہتا..... اس بات سے محمد بہت مطمئن تھا اور وہ خوب دل لگا کر کام کرتا..... اُن کے کاروبار میں بھی بہت ترقی ہو رہی تھی اور مرغیاں بھی اتفاق سے عام بیماریوں سے محفوظ رہیں۔ دو تین برس یوں ہی بیت گئے اور ایک دن اچانک بڑھیا اللہ کو پیاری ہو گئی..... محمد کو تو کچھ ہوش نہیں تھا اور نہ اُسے اس بات کا علم تھا لیکن بڑھیا نے پٹواری اور نمبردار سے

مل کر محمد کو اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا وارث مقرر کر دیا تھا۔ گویا اب محمد بلا شرکتِ غیرے تمام اثاثے کا مالک تھا۔ کچھ دنوں تک تو اُسے یقین نہ آیا لیکن آہستہ آہستہ اُس کے چال چلن اور برتاؤ سے گاؤں والوں سے لے کر شہر کے دکاندار تک یہ محسوس کرنے لگے کہ محمد وہ اب خود کو خوجہ کہلوانا چاہتا ہے۔

اس بات سے کچھ لوگ بیٹھے بٹھائے اُس کے دشمن بن گئے اور کچھ لوگوں نے اُس کٹورے کا سراغ بھی لگایا جو محمد نے بازار میں ٹھٹھیارے کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ گاؤں میں آوارہ لڑکوں کی ایک ٹولی کے سپرد صرف یہی کام تھا کہ وہ مرغی خانے کے قریب محمد وانڈا اور محمد کٹورا کے نعرے لگائے۔ پہلے تو محمد دل پر جبر کر کے اپنے گھر میں بیٹھا رہا۔ لیکن ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اُس نے آوارہ لڑکوں کا تعاقب کر کے ایک آدھ کا سر بھڑا، اور کسی کی ٹانگ ٹوڑ کر رکھ دی۔

اب معاملہ مقدمہ بازی پر پہنچا اور بازار سے گزرتے ہوئے بھی محمد کو "انڈے کٹورے والا خوجہ" کے نعرے سننے پڑتے۔ دیکھتے دیکھتے یہ محاورہ بھی لوگوں کی زبان پر عام ہوا کہ "خوجہ محمد کے انڈے گیارہ لے اور بارہ بیچے"۔ آخر وہ فیصلہ کن گھڑی آگئی جب محمد نے اپنے کاڑبار اور جائیداد پر لات مار دی۔

اس کے بعد محمد کبھی کشمیر میں نظر نہیں آیا لیکن "گیارہ لے اور بارہ بیچے" کا محاورہ محمد کے کٹورے کی طرح کشمیری زبان میں آج بھی موجود ہے۔

قدیم کہانی غنی بابا کی زبانی

یہ کہانی مجھے غنی بابا نے سنائی۔ غنی بابا کشتوار کا
رہنے والا ہے اور آجکل کسی کے ہاں خانساں ہے —
غنی بابا کی عمر پینسٹھ سال ہے۔ غنی بابا کہتا ہے کہ اس
نے یہ کہانی بچپن میں اپنے بزرگوں سے سنی تھی۔

روایت ہے کہ آج جو علاقہ کشتوار کہلاتا ہے، اس تمام علاقے میں کبھی جنگل
اور دلدل کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سب سے پہلے وادی کشمیر کے دو قبیلے راتھر (راٹھور)
اور گنائی وہاں جا کر آباد ہوئے۔ تب یہ علاقہ چیسرھاڑ یا خوبانیوں کا مرکز کہلاتا تھا۔
اس کے بعد خشک خوبانیوں کی یہ سوغات کسی طرح پنجاب تک پہنچی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے
کہ اس علاقے کا موجودہ نام بھی اسی سوغات کے پنجاب تک پہنچنے کا نتیجہ ہے۔ یعنی
خشک خوبانی کو پنجابی زبان میں کشتہ کہتے ہیں لہذا یہ علاقہ اس زبان میں کشتوار یا
کشتوار کہلایا۔ کشمیر کے راتھر اور گنائی قبیلوں کا کہنا ہے کہ پنجاب سے آئے ہوئے

خانہ بدوش پنج ساسیوں نے پہلے پہل یہاں قدم رکھا اور تھو بانیوں کی سبجاست میں یہ
 قبیلوں قبیلے شریک تھے لیکن اس دوستی کی راہ میں شاید تجارت کی دیوار حائل ہو گئی
 اور پنج ساسیوں نے ایک علیحدہ بستی بسانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُدھر جب باہر سے آنے
 والے نو آباد کاروں کو معلوم ہوا کہ پنج ساسی راتھر اور گنائی قبیلوں سے الگ ہو گئے ہیں
 تو انہوں نے پنج ساسیوں کی بستی پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں
 اُجین کا ایک راجہ جو امر ناتھ جی کی یا ترا کے لئے کشمیر آیا تھا، پنج ساسیوں کی بستی
 پر قبضہ کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن پنج ساسی ایک بہادر اور جنگجو قبیلے سے
 تعلق رکھتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سوتے ہوئے بھی اپنے ہتھیار اپنے پاس
 رکھتے ہیں۔ تب راجہ کا ہن پال نے ایک جاسوس کو سادھوئے بمیں میں بدل کر پنج ساسیوں
 کی بستی میں بھیجا۔ سادھوئے اُن کی ایک نوجوان عورت کو بہلا چھسلا کر یہ بھید معلوم
 کر لیا کہ سال میں ایک دن ایسا بھی ہوتا ہے جب پنج ساسی قبیلے کے لوگ اپنے ہتھیار
 کھول کر بستی کے ایک چشمے پر جاتے ہیں جہاں وہ اپنا قومی تہوار مناتے ہیں۔
 سادھوئے یہ خبر راجہ کا ہن پال تک پہنچا دی اور راجہ کے سپاہی گھات لگا کر
 بیٹھ گئے۔ صبح کو جب پنج ساسی قبیلے کے لوگ تہوار منانے کے لئے چشمے پر جمع ہوئے
 تو راجہ کے سپاہیوں نے چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ یوں پنج ساسیوں کو موت کے
 گھاٹ اتار کر ایک غیر ملکی لشکر نے راتھر اور گنائیوں کے کشمیری قبیلوں کو بھی محکوم
 بنایا۔ اور یہ لوگ صدیوں تک غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

آخوند مُلّا کی داستان

ایک آخوند کے چار بیٹے تھے۔ ایک دن مُلّا نے اُن سے کہا کہ ”میں بوڑھا ہو چکا ہوں بتاؤ بھلا تم لوگ کیا کام کرو گے؟ ایک بیٹے نے کہا میں امامت کر لوں گا۔ دوسرا بولا کہ میں اذان دیا کروں گا۔ تیسرا بولا کہ میں واعظ بنوں گا، چوتھا بیٹا بولا کہ ”میں تو چور بنوں گا“

ایک دن یہی چوتھا بیٹا چوری کی نیت سے بادشاہ کے محل کی طرف چل دیا۔ جب وہ اندھیری رات میں بادشاہ کے محل میں داخل ہوا، تو اس نے کیا دیکھا کہ اند سے شہزادی اور وزیر دبے پاؤں باہر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ آخوند زادہ کھڑا ہو گیا، اور ان سے پوچھنے لگا کہ آپ لوگ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم چور ہیں۔ لیکن تم کون ہو؟ کہنے لگا کہ میں بھی چور ہوں۔ وزیر نے شہزادی کو گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ دوسرے گھوڑے پر آخوند زادہ کو یہ کہہ کر بٹھا دیا کہ خاتون کے ساتھ گفتگو نہ کرنا اور چیخ سے رات بھر سفر کرتے رہو۔ تم دونوں چلے چلو، میں بھی سمجھے سمجھے آ رہا ہوں۔ یہ دونوں مسافر گھوڑوں پر سوار ہو کر چپ چاپ ساری رات چلتے رہے شہزادی

کے خواب خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اُس کے ساتھ وزیر کے بدلے آخوند زادہ سفر کر رہا ہے۔

صبح کو جب پو پھوٹنے لگی تو دونوں ایک دریا کے کنارے گھوڑوں سے نیچے اترے۔ شہزادی منہ دھونے کے لئے دریا کی طرف نکل گئی اور منہ دھوتے ہوئے ایک بیش قیمت ہیرا اُس نے دریا میں پڑا پایا۔

شہزادی یہ ہیرا لے کر آخوند زادہ کے پاس آگئی۔ اب کہیں دن کی روشنی میں اُسے معلوم ہوا کہ جسے وہ وزیر سمجھ رہی تھی، وہ کوئی اور ہے۔ ہیرے کی چمک بڑھتی ہی چلی گئی۔ دونوں اس ہیرے کو چھپا کر ایک شہر میں پہنچ گئے۔ آخوند زادہ نوکری تلاش کرتا ہوا بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ بادشاہ نے پوچھا، کون سی نوکری کر سکتے ہو، وہ کہنے لگا گھوڑوں کی ٹہل سیوا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ بادشاہ کے دربار میں ایک جوہری آگیا جس کے پاس دو ہیرے تھے۔ آخوند زادے نے ہیروں پر ایک نظر ڈالی۔ اور بادشاہ سے کہنے لگا کہ جہاں پناہ ایک ہیرا تو انمول ہے لیکن دوسرا بالکل کھوٹا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تمہیں کیوں معلوم ہوا؟ کہنے لگا کہ جہاں پناہ دوسرا ہیرا بالکل بیکار ہے۔ آپ اسے توڑ کر دیکھئے اس میں ایک کپڑا ہے اور اگر اس میں سے کپڑا برآمد نہ ہوا تو مجھے ہر سزا منظور ہے۔ دوسری صورت میں یقیناً آپ مجھ پر کوئی نوازش کریں گے۔

راوی کہتا ہے کہ ہیرے کو توڑا گیا اور اس میں ایک کپڑا نکلا، اسی وقت آخوند زادہ سائیس کے بدلے ہیروں کے پارکھ کی حیثیت سے بادشاہ کے خدام میں شامل ہو گیا۔ یعنی جوہری بن کر آخوند زادہ دن گزارتا رہا۔ دن کو بادشاہ کے دربار میں ہیروں کی پہچان کا کام کرتا اور رات کو گھر جا کر آرام کرتا۔

ایک روز بادشاہ کا تائی جوہری کی حجامت بنانے اُس کے گھر چلا گیا اور وہاں اُس کی

خوبصورت بیوی کو دیکھ کر دمگ رہ گیا۔ وہاں سے شاہی حجام نے سیدھے وزیر کے گھر کا رخ کیا اور وزیر سے کہنے لگا کہ وزیر صاحب..... جوہری کے گھر ایک ایسی خوبصورت حسینہ ہے جسے وزیر کی بیوی ہونا چاہیے۔ کوئی ایسی تدبیر کیجیے کہ وہ چاند آپ کے گھر چمکے۔ وزیر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور سیدھا بادشاہ کی لڑکی کے پاس چلا گیا، اور بہلا پھسلا کر لڑکی سے کہا کہ آپ اپنے والد سے کہیے کہ وہ آپ کو اسی قسم کا دوسرا انمول ہیرا لاکر دیں جو ہیرا آج درباری جوہری کی پسند پر بادشاہ سلامت نے آپ کے لئے خریدا ہے۔

شہزادی نے بادشاہ سے ویسے ہی دوسرے انمول ہیرے کی فرمائش کی۔ لعل شناس دربار میں آیا تو بادشاہ نے مطالبہ کیا کہ دوسرا ہیرا تلاش کر کے لایا جائے۔ لعل شناس گھر پہنچا اور گھجھا گھجھا سا خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ بیوی نے پوچھا کہ غمگین کیوں ہو؟ کہنے لگا کہ بادشاہ نے دوسرا ہیرا طلب کیا ہے، میں بھلا کہاں سے حاصل کر لوں؟ بیوی کہنے لگی کہ اپنے بادشاہ سے ایک مہینے کے لئے سفر خرچ مانگو بادشاہ سے مہینے بھر کے اخراجات لے کر گھر آیا اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر جب ایک مہینہ پورا ہونے کو آیا تو شہزادی نے وہی ہیرا جو دریا میں منہ دھوتے ہوئے اٹھایا تھا لعل شناس کے حوالے کیا، لعل شناس نے ہیرا لے کر بادشاہ کو سلام کیا اور ہیرا پیش کیا۔ شام کو لعل شناس اپنے گھر آکر سو گیا، اور صبح سویرے شاہی حجام حاضر ہوا جوہری کے گھر میں پھر اسی خوب صورت خاتون کو دیکھ کر حجام نے وزیر کے گھر کی راہ لی، اور وزیر سے کہا کوئی جتن کیجیے کہ وہ خاتون صرف آپ ہی کے گھر کی زینت ہو سکتی ہے۔ وزیر پھر بادشاہ کی لڑکی کے پاس گیا اور کہا کہ آپ بادشاہ سلامت سے ہیروں کا ایک پورا ہار مانگیئے۔

شہزادی نے اپنے والد سے ہیروں کی فرمائش کی۔ جوہری سلام کو حاضر ہوا تو

بادشاہ نے ہیروں کے ایک ہار کی فرمائش کی، وہ چُپ چاپ گھر چلا آیا۔ بیوی نے پوچھا کہ خاموش کیوں ہو؟ کہنے لگا کہ آج تو بادشاہ نے ہیروں کے ہار کی فرمائش کی ہے، میں بھلا کہاں سے لاؤں؟

بیوی نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بادشاہ سے جا کر کہو کہ تین مہینے کے اخراجات چاہئیں۔ تین مہینے کے لئے اخراجات لے کر جو تہری اپنے گھر واپس آگیا، اور آرام سے دن گزارنے لگا۔ تین مہینے گزرنے پر بیوی نے لعل شناس سے کہا کہ جس دریا کے کنارے پر مجھے میرا ملا تھا اسی کنارے سے ذرا دو چل کر تمہیں ایک چشمہ ملے گا اُس چشمے کے قریب ایک گڑھا کھود کر اُس میں چھپے رہو۔ وہاں چھپ پر یاں نہانے کے لئے آئیں گی۔ انہیں سمجھ نہ کہنا لیکن اُن کے جانے کے بعد جب اُن کی سردار کپڑے اُتار کر چشمے کے کنارے رکھ لے گی اور نہانے کے لئے چشمے میں اترے گی۔ تم چپکے سے جا کر اس کے کپڑے چھپالیا۔

چھ پر یاں چشمے سے نہا کر نکلیں تو ساتویں پری نے نہانے کی غرض سے چشمے کے کنارے اپنا لباس اُتار کر رکھ دیا۔ جوہری دبے پاؤں اس کے کپڑے اٹھا کر پاس ہی گرٹھے میں جا کر چھپ گیا۔

پری نہا کر نکلی تو اپنا لباس غائب دیکھا، چلا کر بولی کہ تم دیو ہو یا انسان ہو۔ تمہیں اپنے پروردگار کی قسم ہے میرے بھید کو چھپا رہنے دو۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو، مجھ سے طلب کر سکتے ہو۔ لعل شناس نے اُسی گرٹھے میں سے آواز دی کہ پہلے میرا مطالبہ ماننے کا وعدہ کر لو۔ پری نے وعدہ کیا اور لعل شناس نے پری کا لباس اُسے لوٹا دیا۔ کپڑے پہن کر پری بولی کہ اب آپ حکم کیجئے۔ لعل شناس نے کہا کہ میرے ساتھ چلئے۔ اب وہ آگے آگے اور پری جس کا نام لعل مال یعنی ہیروں کی مالا تھا اس کے پیچھے پیچھے اُس کے گھر پہنچے۔

راوی کہتا ہے کہ یاتواس پری کی باتوں سے موتی بھڑتے تھے یا پھر وہ اپنے منہ سے روزِ سات مہیرے زمین پر پھیرتی تھی۔ صبح ہوئی تو جوہری ساٹھ ہیرے لے کر دربار میں پہنچا۔ بادشاہ کو سلام کیا، اور ہیرے پیش کر دیئے۔ بادشاہ بہت مسرور ہوا۔

لعل شناس رخصت لے کر گھر پہنچا تو شاہی حجام بھی حجامت کے یہاں اس کے پیچھے بھاگا۔ وہاں ایک اور حسینہ کو دیکھ کر ننگے پاؤں وزیر کے پاس پہنچ کر چیخنے لگا کہ اے وزیر! جوہری کے گھر آج ایک اور حسینہ ٹھہری ہوئی ہے، جو پہلی عورت سے بھی زیادہ خوب صورت ہے کوئی سازش گھڑ لو، ایک عورت تمہارے لائق ہے تو دوسری ملکہ بننے کے قابل ہے۔ وزیر نے کہا کہ لو پھر میں بادشاہ کی لاڈلی بیٹی کے پاس جاتا ہوں۔ وزیر نے شہزادی سے جا کر کہا کہ اپنے ابا جان سے پاتال کا کنگن مانگ لیجئے۔ شہزادی نے جا کر بادشاہ سے کنگن کا مطالبہ کیا۔ دوسرے روز جوہری دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے پاتال کنگن کا مطالبہ کیا۔

جوہری نے گھر پہنچ کر دونوں بیویوں سے کہا کہ آج بادشاہ نے پاتال کنگن کا مطالبہ کیا ہے۔ پرسی بولی کہ بادشاہ سے تین ماہ کے اغراجات کا مطالبہ کرو۔ بادشاہ سے رتم لے کر اپنے گھر آیا اور تین مہینے آرام سے بیٹھا رہا، تب لعل مال پری نے ایک خط لکھا اور جوہری سے کہا کہ اُسی چشمے پر جاؤ جہاں سے تم مجھے ساتھ لائے تھے، یہ کاغذ اس چشمے میں ڈال دو تو پانی میں سے ایک ہاتھ برآمد ہوگا اُسی کلائی میں وہ کنگن بھی ہے لیکن دیکھنا کہیں خود چشمے میں نہ اُترنا۔

جوہری پری کا خط لے کر گیا اور جوہری خط کو چشمے میں ڈالا چشمے سے ایک ہاتھ پانی کے اوپر آیا جو کنگن لئے ہوئے تھا (گھبراہٹ اور مسترت کے مانے) جوہری نے اتنی شدت سے ہاتھ کو کھینچا کہ کنگن کے ساتھ اس جل پری کا ہاتھ بھی جدا ہو کر

جوہری کے ہاتھ میں آ رہا۔ رات کو گھر پہنچ کر جوہری نے دم لیا اور صبح ہونے ہی دربار میں حاضر ہوا، اور سلام کہہ کر بادشاہ کے سامنے گنگن رکھ دیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور لعل شناس اپنے گھر چلا آیا۔ حجام پھر حاضر ہو کر حجامت بنانے لگا اور وہاں سے وزیر کے گھر پہنچ کر پھر وہی بات دھرائی کہ میاں وزیر صاحب آخر آپ اس لعل شناس کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے؟

وزیر نے شہزادی سے جا کر کہا کہ آپ شہزادی ہو کر صرف ایک ہی گنگن پہنیں گی؟ شہزادی نے والد سے دوسرے گنگن کا مطالبہ کیا۔ جوہری سلام کے لئے دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے دوسرا گنگن لانے کو کہا۔ گھر پہنچ کر اپنی دونوں بیویوں سے ماجرا بیان کیا کہ بادشاہ نے ایک اور گنگن لانے کو کہا ہے۔ لعل پری نے اپنی انگوٹھی دے کر کہا کہ اس چشمے پر چلے جاؤ اس کے نزدیک ایک بھاری پتھر ملے گا، میری انگوٹھی کو دیکھتے ہی وہ پتھر اپنی جگہ سے ہلے گا اور اس کے نیچے بیڑھیاں اُتر کر ایک خاتون تمہیں بیٹھی ہوئی ملے گی وہ میری سہیلی ہے اور اُسی سے تمہیں دوسرا گنگن حاصل ہو گا۔ گھر سے رخصت ہو کر جوہری اس پتھر تک پہنچا اور پری کی انگوٹھی دیکھتے ہی بھاری پتھر نے اپنی جگہ سے ہل کر جوہری کو راستہ دیا۔ نیچے پہنچ کر جوہری نے ایک خاتون کو تنہا پایا۔ پوچھا کیسے آنا ہوا؟ کہنے لگا لعل مال پری نے دوسرا گنگن مانگا ہے اب اس خاتون کو یاد آیا کہ پہلا گنگن بھی تو میری امی کے بازو سے ہی کسی نے اُتارنے وقت ان کو تکلیف پہنچائی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی آدمی ہو گا اور میری امی اپنے بازو کے ضائع ہونے کا دکھ کبھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ خاتون نے سوچا کہ جوہری میری ماں گھر واپس آئی تو وہ یقیناً اس خوبصورت نوجوان کو کچا چبائے گی۔ خاتون جوہری کو دیکھتے ہی دل سے بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں اُس کی امی کی آمد آمد سے ایک زلزلہ برپا ہوا۔ خاتون نے نوجوان کو ایک کنکر میں بدل کر اپنی جیب میں چھپا لیا۔ ماں اندر آتے ہی بولی کہ بیٹی مجھے بڑی

سخت آدم بڑا آدم ہی ہے۔ لیکن بیٹی نہ مانی۔ آخر اپنی اماں سے یہ عہد لے لیا کہ وہ نوجوان کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ خاتون نے جیب سے ایک کنکر نکالا اور اسے پھر نوجوان جوہری کا روپ بخشا۔ اپنی اماں سے کہنے لگی کہ یہی میرا مقدر ہے اور میں اسی نوجوان کو خواب میں دیکھا کرتی تھی۔ اُمی جان مجھے اللہ میاں نے میرے خواب کی تعبیر عنایت کی ہے۔ ماں کہنے لگی کہ ٹھیک ہے اسی نوجوان کے ہاتھ اپنے دونوں بھائیوں کو پیغام بھیج دو کہ وہ آکر تمہاری شادی میں شریک ہو جائیں۔ ماں نے بیٹے کے نام خط لکھا، اور جوہری کے ہاتھ میں تھما دیا کہ وہ یہ خط لے کر چلا جائے۔ فٹکی نے نوجوان کو آواز دی، اور خط پر ایک نظر دوڑائی۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر تم دونوں میرے بیٹے ہو، تو اس نوجوان کو دیکھتے ہی جان سے مار ڈالنا۔ دراصل یہ خط لکھتے وقت بڑی بی کو اپنے بازو کی تکلیف بہت یاد آرہی تھی، اس خط کو تو خاتون نے پھاڑ ڈالا اور اپنی طرف سے ایک اور خط اس عبارت کا لکھا کہ اگر میرے بھائی ہو تو جلدی سے گھر آ جاؤ تاکہ میری شادی میں شریک ہو سکو۔ یہ خط جوہری کے حوالے کر کے خاتون نے زبانی اُسے یہ نصیحت بھی کی کہ میرے دیو زاد بھائیوں کے پاس پہنچو تو سلام کہہ کر انہیں یہ خط دے دینا۔ وہ تمہیں کھانے کے لئے چمڑے کے چنے پیش کریں گے۔ لہذا میں تمہیں یہ خستہ چنے دے رہی ہوں کہ چمڑے کے چنے گریبان میں ڈال کر یہ اصلی چنے چباتے رہنا، اس کے بعد وہ تمہیں اُن کی پیٹھ کھجائے کو کہیں گے۔ اس کام کے لئے یہ لوہے کا پنجرہ رہی ہوں، اسے تم چھپا کر رکھنا کہ اسی سے ان دیو زادوں کی تسلی ہو سکے گی۔ خاتون کی نصیحت پلے باندھ کر نوجوان جوہری دیو زادوں کے پاس پہنچ گیا۔ سلام کہنے اور خط دینے کے بعد جواب میں دیو زادوں نے اسے بٹھا کر کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا اور چمڑے کے چنے جوہری کے سامنے لا کر رکھ دیئے۔ مٹھی بھر چنے اٹھا کر اُس نے گریبان کی راہ سے گرا دیئے اور اپنی جیب سے خستہ چنے نکال کر چمچے سے کھانا

رہا۔ اس کے بعد پیٹھ کھجھانے کی فرمائش پر جوہری نے دیو زادوں کی پیٹھ کو اُسی لوہے کے پیچے سے سہلایا۔ اسی دوران دونوں بھائیوں نے بہن کے خط کے جواب میں لکھا کہ ”ہمیں حضرت سلیمان نے طلب کیا ہے لہذا شادی میں شرکت کے لئے موقع نہیں ہے بہر حال تم اللہ کا نام لے کر شادی کی رسمیں ادا کر لو۔“

رقعہ لے کر جوہری دونوں ماں بیٹیوں کے پاس آیا اور شادی کا سارا معاملہ طے ہو گیا۔ تب اس خاتون نے اپنے میاں سے کہا کہ اب تم یہاں پر زندگی گزارنا چاہتے ہو یا واپس دنیا میں چلے جاؤ گے؟ کہنے لگا کہ دنیا کو واپس چلے جائیں گے۔ خاتون نے کہا کہ میں تو تمہارے حکم کی غلام ہوں۔ لیکن ایک بات نہ بھولنا، جاتے وقت میری امی ضرور تم سے کہے گی کہ مجھ سے کوئی چیز مانگو، اس وقت تم اس سے وہ مُصلّی مانگ لینا جس پر وہ بیٹھتی ہے۔

جب دونوں میاں بیوی کی رخصتی کا وقت آن پہنچا تو امی نے کہا کہ کوئی چیز تو لیتے جاؤ، جوہری نے کہا کہ وہ جو بچھانے والا مُصلّی ہے بس وہی دیجئے اور ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ راوی کہتا ہے کہ اس مُصلّی کا نام اُڑن کھٹولا ہے۔ دونوں میاں بیوی شہر میں پہنچے تو دوسرے روز جوہری کنگن لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حجام نے سنا تو بھاگا بھاگا لعل شناس کے گھر حجامت کے بہانے پہنچ گیا وہاں ایک تیسری خاتون کو دیکھ کر حجام کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں وہاں سے نکل کر حجام نے وزیر کو جاکر کہہ دیا کہ آج جو تیسری خاتون جوہری کے گھر میں دیکھ آیا ہوں وہ یقیناً بادشاہ کے قابل ہی ہو سکتی ہے۔ دوسری تمہارے لئے موزوں ہے اور تیسری کے ساتھ میری شادی ہو سکتی ہے لیکن ہم لوگ لعل شناس کو کسی ٹھکانے لٹکائیں تو بات بنے گی۔ وزیر نے کہا کہ آج میں بادشاہ کے پاس جاکر کوئی تدبیر کرتا ہوں۔ کیونکہ جوہری کے مرنے کے بعد ہی ہم ان تینوں عورتوں کو ہتھیاسکیں گے۔

وزیر نے بادشاہ کو یہ پٹی پڑھا دی کہ عالم پناہ اس جوہری کے گھر میں تین ایسی حسین عورتیں ہیں جن کا ثانی شاہی محل میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ کسی بہانے آپ اس جوہری کو ٹھکانے لگا دیجئے تاکہ تینوں حسنائیں شاہی محل میں داخل ہو سکیں۔

بادشاہ نے سوچا کہ کوئی بھی چیز جو ہر شناس سے لانے کو کہہ دوں تو وہ یقیناً لے آتا ہے اب یہی ایک انہونی باقی ہے کہ میں اسے اپنے مرحوم باپ کی یہ خبر لانے کو کہہ دوں کہ میرا باپ جنت میں ہے یا جہنم میں مقیم ہے۔

دوسرے روز جوہری نے دربار میں آکر بادشاہ کو سلام کیا تو بادشاہ نے کہا کہ آج تک جو بھی میں نے تم سے مانگا سو تم نے مجھے حاصل کر کے دے دیا اب آج میں تمہارے سپرد یہ کام کر رہا ہوں کہ تم میرے والد مرحوم کی خبر لے آؤ۔ آیا وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں۔ جو ہر شناس نے گھر پہنچ کر تینوں خواتین کو سارا قصہ سنایا کہ آج بادشاہ سلامت مجھے اپنے مرحوم باپ کی خبر لانے کو کہہ رہے ہیں جو خدا جانے کب کے وفاق پا گئے ہیں۔ اب میں کیا کروں بھلا؟ کنگن بنانے والی خاتون نے جو بڑی اہل اللہ تھیں۔ جوہری سے کہا۔ کہ تشویش کی کوئی بات نہیں جائیے اور بادشاہ سے سفر کے اخراجات حاصل کر لیجئے اور یہ بھی کہیے کہ وہ شمشان بھومی میں ڈھیر ساری خشک لکڑیاں جمع کر وادیں۔ بادشاہ نے میدان میں سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا اور لعل شناس جادو کا پھوننا پچھا کر لکڑیوں کے اُس انبار کے اوپر جا کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ سے کہنے لگا کہ آپ کے والد کی کون سی نشانی آپ کو لا کر دوں؟ بادشاہ نے کہا کہ ایک تو جنت کا میوہ لے کر آنا اور دوسرے میرے باپ کے دستخطوں سے ایک چٹھی لے کر آ جانا۔ لعل شناس نے لوگوں کو اشارہ کیا کہ چاروں طرف سے لکڑیوں کے انبار میں آگ لگا دیں۔ راوی کہتا ہے کہ جب چاروں طرف سے آگ کے شعلے اٹھنے لگے اور جوہری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے جادو کے پھونے کو قسم دے کر کہا کہ مجھے لوگوں کی نظروں سے

بیچا کر اپنے گھر پہنچا دو۔

جوہری نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھول دیں، تو وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔

خاتون نے یہ کام کیا کہ جنت کے آثار کی طرح ہفت جوشی پھل تیار کر لیا اور بادشاہ کے باپ کی مہر لگا کر ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ :

”میں جنت میں ہوں۔ میرے نو حشیم! تم اپنے وزیر اور حجام کو لے کر بالکل اُسی طرح فوری طور پر میرے پاس پہنچ جاؤ جس طرح تمہارا جوہری پہنچ گیا۔“

خاتون نے یہ خط اور انار دونوں چیزیں جوہری کے حوالے کر دیں۔ چار دن گزر چکے تھے اور لکڑیوں کا انبار جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ صبح منہ اندھیرے جوہری لنگوٹ کس کر اُس راکھ کے ڈھیر میں جا بیٹھا۔

نظر بازوں نے نظر دوڑائی اور مخبروں نے بادشاہ کو خبردار کیا کہ راکھ کے ڈھیر میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے، شاید جوہری واپس آ گیا ہے۔ ابھی دربار میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جوہری ایک ہاتھ میں چمپٹی اور دوسرے ہاتھ میں انار لئے داخل ہوا، اور بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے خط کی عبارت پڑھی کہ بیٹا! میں جنت میں ہوں، اور تم اپنے وزیر اور نانی کو لے کر فوراً آ جاؤ۔ بادشاہ سوچ میں پڑ گیا کہ میں تو جوہری کو ختم کرنے کے درپے تھا، اب یہ میرے والد کی خبر لے کر آ رہا ہے۔ جوہری کی طرف مخاطب ہو کر بادشاہ نے کہا کہ میں اس جنت تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ جوہری نے کہا کہ جتنی لکڑی آپ نے میرے لئے جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اتنی ہی خشک لکڑی جمع کرنے کا حکم دیجئے۔ بادشاہ نے لکڑیاں جمع کروا دیں اور اُس پر بستر لگا دیا۔ بادشاہ نے وزیر اور نانی کو اپنے ساتھ لکڑیوں کے اس ڈھیر پر بیٹھنے کو کہا اور چاروں طرف سے آگ لگوانے کا حکم دیا۔

راڈی کہتا ہے کہ یوں تینوں آدمی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ ادھر اب وہ پہلا

وزیر بھی جوہری (آخوندزادہ) کے پاس پہنچ گیا، جو بادشاہ کی لڑکی کورات کے اندھیرے میں شاہی محل سے نکالتے ہوئے آخوندزادے کو اتفاقاً مل گیا تھا۔ وہی وزیر اب آخوندزادے کے گھر پہنچا تو دونوں کی ملاقات ہوئی، وزیر کو آخوندزادے نے اپنے سفر کی تمام داستان سنائی اور ان مصیبتوں کا تذکرہ کیا جن کا شکار اُسے حجام اور وزیر کی سازش کی وجہ سے ہونا پڑا۔

اب آخوندزادے نے وزیر سے کہا کہ آپ اپنی خاتون (شہزادی) کو اپنے ساتھ لیتے جا بیٹے۔ لعل مال پری کو اپنے چشمے (پاتال) پر جانے کی اجازت مل گئی، اور وہ پری جسے آخوندزادہ بیاہ کر لایا تھا اُس کی بیوی بن کر اُسی کے ساتھ رہنے لگی۔ آخر طے یہ پایا کہ وزیر اب بادشاہ کے تخت پر بیٹھے گا اور آخوندزادہ اس کی وزارت کا قلمدان سنبھالے گا۔

३४

سُلطان محمود غزنوی اور مجھیر (منظوم)

- ۱۔ شہنشاہ سلطان محمود غزنوی اپنے ملک کے نظام کی آپ دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔
- ۲۔ سلطان خود فقیر بن کر اس بات کا کھوج لگاتا تھا کہ میرے دُورِ حکومت میں کوئی ناتواں بھوکا تو نہیں ہے ؟
- ۳۔ جگہ جگہ عوام بادشاہ کی خیر مانگتے اور سلطان کے عدل کی وجہ سے لوگ سیرِ چشم بھی تھے۔
- ۴۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلطان نے ایک جگہ کسی ہانچی (مجھیرے) کو دیکھا جو تنگدستی اور غربت کی وجہ سے اس قدر ذلیل ہو کر رہ گیا تھا کہ اس کا چہرہ اس کے ابتر حالات کی تصویر دکھاتا تھا۔
- ۵۔ یہ مجھیرا پانی میں بہتیرے جال مچھینکتا لیکن جال میں کبھی کوئی مچھلی بھول کر بھی نہ آتی۔
- ۶۔ سلطان نے مجھیرے کی یہ حالت دیکھ کر اُس سے کہا کہ میرے ساتھ شراکت

- کر د اور اللہ کا نام لے کر سچی نیت سے جال پھینکو۔
- ۷۔ مچھیرے نے پہلی مرتبہ جال دریا میں پھینکا تو ایک تسو مچھلیاں پائیں جنہیں لے کر وہ فقیر (سلطان) کے قدموں میں حاضر ہوا، اور اپنے ساتھی کو اپنی پسند کے مطابق آدھی مچھلیاں چُھنے کی گزارش کی۔
- ۸۔ بادشاہ نے اُس کے حصے کی مچھلیاں بھی خرید لیں اور اُسے مالا مال کر دیا۔
- ۹۔ دوسرے روز بادشاہ نے مچھیرے کو دربار میں طلب کر کے فرمایا کہ تم میرے کل کے ساتھی ہو، کل تک تم نامراد تھے لیکن دیکھ لو۔
- ۱۰۔ دُکھ اور نامرادی کے دن دُور کرنا تو پروردگار کی حکمت ہے، دولت اور غربت تو دھوپ چھاؤں کی مانند ہے۔
- ۱۱۔ اصل بات یہ ہے کہ سچے دل سے تمہیں اللہ کی بندگی منظور ہو، ورنہ محض اپنی عقل کے بل بوتے پر غربت اور افلاس کو دُور کرنا ناممکن ہے۔
- ۱۲۔ یہی بات کہہ کر استاد احمد اللہ سے اپنی غربت اور عذاب سے نجات کے لئے دعائیں مانگتا ہے کہ ساری دنیا اپنے اُسی پروردگار سے نجات کی طالب ہے۔

راجہ کی کہانی

راوی کہتا ہے کہ چار مسافر راہ چلتے چلتے ایک بڑے میدان میں آ گئے۔ اس میدان میں قدم رکھتے ہی ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ بھائی قصہ سناؤ کہ میدان کی مسافت طے ہو سکے۔ اُن کے سمجھے ایک اور مسافر چلا آ رہا تھا۔ اُس سے کہنے لگے کہ ”میاں کوئی ”کٹھا“ سناؤ۔“ اُس نے جواب دیا کہ میں داستان تو سناؤں گا۔ ایک کٹھا نہیں بلکہ پانچ کٹھائیں۔ (کٹھا کے معنی ایک بات اور داستان بھی ہیں) لیکن پانچ کٹھاؤں کے عوض مجھے پانچ سو روپے کا معاوضہ ملنا چاہیے۔ ان چاروں نے جواب دیا کہ ہم چار آدمی تمہیں چار سو روپے دیں گے۔ پانچواں سینکڑہ تم اپنی گرہ سے بکلا ہوا سمجھ لو، اور پانچ کٹھائیں سناؤ۔ الو۔ کہنے لگا :

- ۱۔ دولت سفر میں ساتھ دیتی ہے۔

۲۔ دوست مصیبت میں ساتھ دیتا ہے۔

۳۔ رشتہ دار صرف بھلے وقتوں میں آشنا ہوتا ہے۔

تین باتیں تو یہ تھیں اور دوسری دو باتیں یہ ہیں کہ اُس عورت کو تم

اپنی بیوی خیال نہ کر دجونی الوقت تمہارے پاس نہیں ہے یعنی مالِ عرب پیشِ عرب۔
 پانچویں کتھا یہ ہے کہ "جو شخص رات بھر جاگتا رہے گا وہی راجہ وکرماجیت کی بیٹی کو
 جیت لے گا۔" پانچویں مسافر نے یہ پانچ باتیں بیان کیں تو چاروں مسافر یہ مطالبہ
 دھرانے لگے کہ کتھائیں سناؤ..... اس نے جواب دیا کہ میں نے پانچوں باتیں
 بیان کر دیں ہیں..... اس پر جھگڑا ہو گیا۔

چاروں مسافر کہہ رہے تھے کہ ہم سے چار سو روپے ہتھیا کر تم نے تھتے نہیں
 مسائے اور ابھی طویل میدان کو طے کرنے کا کھٹن سفر بھی باقی ہے چاروں نے مل
 کر داستانِ گو کی ٹپائی کر دی۔ اُس نے کہا کہ چلو یہاں کے بادشاہ کے پاس چلے جائیے
 ہیں جو فیصلہ بادشاہ دے گا وہی سب کو منظور ہو گا۔

راوی کہتا ہے کہ پانچویں مسافر بادشاہ کے پاس گئے۔ چار مسافروں نے فریاد کی کہ
 جہاں پناہ اس شخص نے کہانیاں سنانے کا وعدہ کر کے ہم سے چار سو روپے ہتھیا لئے۔
 بادشاہ نے پانچویں مسافر سے پوچھا کہ تم نے ان لوگوں سے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سنا

دو.....

مسافر بولا کہ بادشاہ سلامت میں وہ پانچوں باتیں حرفِ بحرف آپ کے سامنے
 بیان کرنے کو تیار ہوں لیکن میں آپ سے بھی پانچ سو روپے طلب کروں گا۔
 بادشاہ نے اُسے پانچ سو روپے دے دیئے اور پانچوں باتیں سننے کے بعد ان
 پانچوں مسافروں کو گرفتار کئے رکھا۔

خود بادشاہ نے یہ کام کیا کہ شاہی لباس اتار کر گدائی کا لباس پہنا اور سات
 قیمتی ہیرے اپنے بازو پر باندھ کر ان پانچ باتوں کی حقیقت کا سراغ لگانے کی
 غرض سے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

راوی کہتا ہے کہ سب سے پہلے بادشاہ نے اُس شہر کا رخ کیا جہاں اُس کی

پیاری بہن بیابھی گئی تھی۔ جب اُس شہر کے نزدیک پہنچا تو اپنی بہن کو یہ پیغام بھیجا کہ میں
(بادشاہی گنوا کر) در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں، اجازت ہو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں!
بہن نے جواب میں یہ پیغام بھیجا کہ تمہارے یہاں پڑے رہنے سے سُسرال والے مجھے ساری
عمر طعنے دیتے رہیں گے۔

بادشاہ نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ اگر میں آپ کے دربار میں نہیں آ سکتا تو خیر۔
فی الحال میرے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیجئے اور میری ضرورت کی تمام چیزوں کو کسی
چیز میں لپیٹ کر اُس پر اپنی مہر بھی ثبت کر دیجئے گا۔ اس پیغام کے جواب میں بادشاہ
کی بہن نے اپنے کھانے کے برتن میں (جوٹھا یا صاف) تھوڑا سا کھانا ڈال دیا اور اس برتن
کو ڈھکنے کے بعد اس پر اپنی مہر بھی لگا دی۔ بادشاہ نے کھانے کا یہ برتن اُسی جگہ زمین
کے نیچے چھپا کر رکھ دیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اب بادشاہ اپنے دوست کی طرف چل دیا۔ جب نزدیک جا پہنچا تو کسی کے
ہاتھ اپنے دوست کو یہ پیغام بھیجا کہ ”تمہارا دوست (جو اب بادشاہ نہیں رہا)
تم سے ملنے آیا ہے اور بُری حالت میں ہے۔“ دوست نے پیغام سنا تو بادشاہ کی
طرف ننگے پاؤں بھاگا۔ اور لپٹ کر کہا کہ میرے دوست تو نے میری خاطر یہ سفر کیسے
برداشت کر لیا۔ دونوں دوست چل دیئے۔ بادشاہ نے تو گدائی کا لباس پہن رکھا
تھا۔ دوست نے گزارش کی کہ تم مجھے اپنا یہ شاہی خلعت اتار دو، اور میرے کپڑے
خود پہن لو تاکہ میری عزت افزائی بھی ہو، اور میرے دل کو ٹھنڈک پہنچے کہ میرے جسم
پر میرے دوست کے کپڑے ہیں۔“

حقیقت بھی یہی ہے کہ بادشاہ کی یہ گدایانہ پوشاک اُس کے دوست کو خلعت شاہی
دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ اُس کی نظروں میں، اُس کے دماغ میں، ہر جگہ دوست کی
محبت سمائی ہوئی تھی۔ بادشاہ دوست کے گھر پہنچا تو ضیافت کا زبردست اہتمام

کیا گیا.....

..... یوں بادشاہ نے دُوبائیں آزما کر دیکھ لیں.....

اب بادشاہ اپنی بیوی کے میکے کی طرف روانہ ہوا (وہ بھی کسی شہر کے حکمران کی بیٹی تھی اور کئی دنوں سے اپنے میکے گئی ہوئی تھی)۔

شہر کے ایک کونے میں بادشاہ کو ایک بڑھیا کا جھونپڑا نظر آیا اور بڑھیا سے بادشاہ نے ایک درانتی عاریتاً مانگ لی تاکہ وہ اپنے گھوڑے کے لئے گھاس کاٹ کر لے آئے۔ پاس ہی شہر کے حاکم کی چراگاہ تھی جہاں بادشاہ گھاس کاٹنے کے لئے چلا گیا۔ سرکاری چراگاہ کے رکھوالوں نے بادشاہ کو گرفتار کر کے اپنے افسر کے حضور پیش کیا۔ دیہ لوگ شاہی اصطبل کے سائیس تھے اور اُن کا افسر مجیرا (MAJERA) کہلاتا تھا۔

بادشاہ کو حوالات میں قید کر دیا گیا۔ رات کو بادشاہ کیا دیکھتا ہے کہ اصطبل کے افسر کے پاس ایک سگم صاحبہ اپنے سر پر رنگارنگ معتمول کا ایک تھال لئے ہوئے تشریف لاتی ہیں۔ دونوں نے پلنگ پر بیٹھ کر خوب مزے سے یہ دعوت اڑائی جو کچھ جھوٹا پاتی بچا وہ اس قیدی کو بلا کر دے دیا۔ قیدی (بادشاہ) نے قریب آ کر جو دیکھا تو اپنی بیوی کو افسر کے پہلو میں پایا۔ قیدی کھانا لے کر حوالات میں چلا گیا، اور ان دونوں نے اپنی خرمستیوں کے دوران نیچے سجھے ہوئے پلنگ کو توڑ ڈالا۔

افسر نے اس قیدی کو آواز دی کہ تم اس ٹوٹے ہوئے پلنگ کو ٹھیک کر سکتے ہو؟ قیدی بولا۔ جی ہاں میں ویسے بھی سنجاروں کا ہمسایہ ہوں اور یہ کام مجھے خوب آتا ہے، اب جو قیدی پلنگ ٹھیک کرنے کے لئے آیا تو اُس عورت نے (جو اُس کی ملکہ تھی) بادشاہ کو پہچان لیا۔ وہ سرگوشیوں میں اصطبل کے افسر کو بتائے

لگی کہ یہ قیدی میرا خاوند ہے۔ اب ہمارے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ اسے آج ہی رات کو قتل کر دیا جائے۔ اصطبل کے حاکم نے حکم دیا کہ اس قیدی کو جلاد کے سپرد کر کے فوراً قتل کیا جائے۔ کچھ لوگ قیدی کو لے کر شہر سے باہر کی طرف چل دیئے۔ قیدی نے اُن کی منت سماجت کی کہ مجھے اس بہتے پانی میں منہ دھو کر عبادت کرنے کی مہلت دی جائے۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد قیدی عبادت میں مصروف ہوا اور دعا مانگنے کے بعد اُسے اُن قیمتی جواہرات کا خیال آیا جو اُس کے بازوؤں پر بندھے ہوئے تھے۔ اب جلادوں سے مخاطب ہو کر قیدی نے کہا کہ میرے پاس سات ہیرے ہیں، تم چاروں آدمی ایک ایک ہیرا آپس میں بانٹ لو، اور بقیہ تین ہیرے امانت کے طور پر تم اپنے پاس رکھ لو۔ یہ شرط تسلیم ہے تو مجھے رہا کر دو۔

یوں بادشاہ نے چوتھی بات بھی آزمائی۔ لیکن پانچویں بات کیا تھی؟ وہ بادشاہ کے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھی۔ مجبوراً بادشاہ کو واپس اپنے گھر آنا پڑا۔ گھر پہنچ کر اُن پانچ مسافروں کو طلب کیا اور وہی پانچ باتیں پھر سے بیان کرنے کا حکم دیا۔ مسافروں نے برسیل تذکرہ پوچھ لیا کہ بادشاہ سلامت نے کتنی باتوں کو آزمایا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ چار باتیں تو ٹھیک نکلیں۔ کہ :

۱۔ بُرے وقت میں صرف دوست ہی کام آتا ہے۔

۲۔ رشتہ داری صرف بھلے وقتوں کی بات ہے۔

۳۔ وہ عورت جو مرد کے پاس نہیں ہے اس کی اپنی نہیں رہتی اور چوتھی بات بھی صحیح ہے کہ دولت ہی سفر کی رفیق ہے۔ باقی وہی پانچویں بات، سودہ میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ پانچواں مسافر بولا کہ ایک سو روپے ادا کیجئے۔ تب اُس نے یہ پانچویں کتھا دھرائی کہ ”جو شخص رات بھر جاگتا رہے گا وہی شخص راجہ بکر ماجیت کی بیٹی کو جیت کر لائے گا۔“

بادشاہ نے فقیر کا بھیس بدل کر راجہ بکر ماجیت کے دربار کی راہ لی۔ نظر بانوں نے
نظر دوڑائی اور خبرداروں نے یہ خبر پہنچا دی کہ ”راجہ صاحب ایک فقیر کہیں سے آن
ہے جسے دعویٰ ہے کہ وہ راجہ جی کی بیٹی کو جیت لے گا۔“ راجہ بکر ماجیت بولے کہ آج
ایک کتنے ہی راجہ مار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اب اس گداگر کی باری ہے اس
فقیر کا بھی خدا حافظ ہے۔ جاؤ اسے بھی شہزادی کے کمرے تک پہنچا دو۔

فقیر کے لئے ایک پلنگ بچھا دیا گیا۔ فقیر نے راجہ ماری کو، جو دوسرے پلنگ
پر سو رہی تھی۔ جنگایا اور کچھ باتیں کیں۔ راجہ ماری پر دوبارہ میند کا غلبہ ہوا، فقیر نے
اپنے پلنگ پر تکیوں کو بستر کی چادر میں یوں چھپا دیا جیسے کوئی انسان سو رہا ہو۔ خود
پلنگ سے اٹھ کر دُور کسی کونے میں جا بیٹھا۔ کمرے میں شمع جل رہی تھی۔ شہزادی کے
منہ سے ایک سانپ نکلا اور دوسرے پلنگ کی طرف رینگنے لگا۔ سانپ نے تکیے اور
کپڑوں کی گھٹری کو کوئی انسان سمجھ کر ڈسنا چاہا اور ان کپڑوں میں گھس گیا۔ آخر ناامید
ہو کر دوبارہ سوئی ہوئی خاتون کے منہ سے اس کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ فقیر
سمجھ گیا کہ یہ بلا داخلی ہے خارجی نہیں۔ فقیر پلنگ پر آکر بیٹھا اور خاتون کو جنگایا، کچھ دیر
باتیں کرتا رہا اور خاتون پر پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ خاتون سو گئی تو فقیر نے دوبارہ کپڑوں
کی گھٹری کو پلنگ پر اسی ترتیب سے رکھا اور خود کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد
سانپ نے پھر خاتون کے منہ سے اپنا سر نکالا۔ شمع جل رہی تھی سانپ رینگتے ہوئے
پلنگ کی طرف آ گیا۔ جو نہی سانپ کپڑوں کی گھٹری میں داخل ہوا۔ فقیر نے بڑھ کر تلوار
کے ایک وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ سانپ کو پلنگ کے نیچے ڈھیر کرنے کے بعد
فقیر تلوار کو سرانے رکھ کر لمبی ناناں سو گیا۔

رات بسر ہو چکی تو صبح ہوتے ہی راجہ بکر ماجیت نے جلا دوں سے کہا کہ جا کر
شہزادی کے کمرے سے اس فقیر کی لاش تو اٹھا لاؤ۔ ظاہر ہے کہ بے شمار راجہ ماریوں

کی طرح بیچارہ فقیر بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہو گا۔

لوگ شہزادی کے کمرے کی طرف گئے تو دیکھا کہ مہاراج فقیر زندہ ہے۔ راجہ بکر ماجیت نے خود بیٹی کے کمرے میں جا کر فقیر کو مبارکباد دی، پوچھا کہ آپ کس طرح جان بچانے میں کامیاب ہو گئے؟

فقیر نے جواب دیا کہ ”جاگتے رہنے کی وجہ سے“ ذرا پنگ کے نیچے جھانکیے۔ دیکھا تو ایک اڑدھا ٹکڑے ہو کر پنگ کے نیچے پڑا ہوا ہے۔

فقیر نے راجہ بکر ماجیت کو اپنا وعدہ یاد دلایا..... راجہ نے جواب دیا کہ یقیناً خدا ایک ہے اور وعدہ سچا ہے تب فقیر بولا کہ آپ کی بیٹی آپ کے پاس میری امانت ہے، آپ مجھے اپنی نشانی دے کر میری نشانی اپنے پاس رکھیے۔ دونوں نے اپنی انگوٹھیاں تبدیل کر دیں۔

فقیر اپنے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ فقیر کا لباس بدل کر شاہی خلعت پہن لیا اور لشکر کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

راوی کہتا ہے کہ سب سے پہلے بادشاہ نے اپنی ہمیشہ کے شہر کی راہ لی۔ اُس شہر کا والی بھی اُسی بادشاہ کا باجگزار تھا۔ بادشاہ نے وہی مہر شدہ برتن زمین سے نکال کر اپنی بہن کے سامنے رکھا اور پوچھا کہ یہ مہر آپ کی ہے؟ کہنے لگی۔ ہاں۔ جواب ملا کہ اس روز کا وہی بھکاری بھائی آج پھر وہ بادشاہ ہے جس کی خدمت میں تمہارے سسرال والے خراج ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ رشتہ داریاں صرف ہونے اور نہ ہونے پر موقوف ہیں۔ اس شہر کے والی سے کچھ مزید لشکر لے کر اب بادشاہ اپنے دوست کے گھر کی طرف روانہ ہوا، رات بھر دوست کے یہاں قیام کیا، اور صبح کو ہنسی خوشی پھر رخت سفر باندھا۔ بادشاہ نے اب اپنے سسر راجہ بکر ماجیت کی سلطنت کا رخ کیا اور بادشاہ سے اپنی اصل حقیقت

بتائے بغیر یہ مطالبہ کیا کہ بکرماجیت اپنے اصطل کے تمام نوکروں کو طلب کرے اور ان سے پوچھ لے کہ پچھلے دنوں جس چور کو انہوں نے شاہی چراگاہ سے گرفتار کر لیا تھا وہ چور اب کہاں ہے؟

اصطل کے سائیسوں نے قنیتش پر بتایا کہ ”انہوں نے چراگاہ کے چور کو اپنے افسر مجیرے کے حوالے کر دیا تھا۔ مجیرے نے صاف انکار کیا لیکن سائیس اپنی بات پر بضد تھے۔ تب بادشاہ نے راجہ بکرماجیت سے کہا کہ آپ ان چار جلاؤں کو طلب کیجئے۔ جلاؤں سے بادشاہ نے پوچھا کہ ایک فقیر قیدی نے تمہارے سپرد کوئی امانت کی تھی، وہ امانت کہاں ہے؟

جلاؤں نے ساتوں ہیرے بادشاہ کے سامنے رکھ دیئے۔ ان میں سے چار ہیرے انہی جلاؤں کو دے کر بادشاہ نے پوچھا کہ یہ ہیرے تمہیں کہاں سے ملے تھے؟

جواب ملا کہ ایک فقیر سے ملے تھے جس کے قتل کا حکم ہمیں اصطل کے افسر نے دیا تھا۔ تب بادشاہ نے مجیرے سے کہا کہ مجھے پہچان لو کہ میں وہی فقیر ہوں جس کے سامنے تم نے اس خاتون کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ کر ضیافت کھائی اور اس کے بعد پلنگ ٹوٹنے پر مجھے آواز دی کہ تم اسے جوڑ سکتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں جانتا ہوں، کیونکہ میرے ہمسایہ میں بڑھئی رہتے ہیں۔ میں تمہارے پلنگ کو جوڑ رہا تھا کہ اُس خاتون نے مجھے پہچان لیا اور تم سے کہا کہ یہ میرا خاندن ہے لہذا اسے آج ہی قتل کر ڈالو۔ پھر تم نے مجھے ان جلاؤں کے سپرد کیا، میں نے ان کی منت سماجت کی، انہیں چار ہیرے دے دیئے اور میں ہیرے ان کے پاس امانت کے طور پر رکھ دیئے۔ یہ رہے وہ ہیرے۔ یوں اصطل کے افسر پر الزام ثابت ہو گیا۔

بادشاہ نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا جس میں اپنی بیوی اور مجیرے کو گھاٹ کر انہیں سنگسار کر کے مروا ڈالا۔

اسی مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ تلوار، سانپ اور عورت کا ٹکڑا فریب
یہ تینوں چیزیں خطرناک ہیں۔

اب بادشاہ راجہ بکرماجیت کے دربار میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں
اپنی بیوی راجہ بکرماجیت کی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔ راجہ نے ادب سے گزارش
کی کہ میری بیٹی تو ایک فقیر کی بیوی بن چکی ہے، تب بادشاہ نے کہا کہ وہ فقیر میں ہی تو
تھا۔ یہ رہی آپ کی نشانی جو میرے پاس ہے اور میری انگوٹھی آپ کے پاس
ہے۔ راجہ حیران ہوا کہ یہ فقیری اور بادشاہی کا چکر کیا ہے۔ تب بادشاہ نے تمام
ماجرا بیان کیا کہ میں نے پانچ باتوں کی تصدیق کے لئے گدائی کا بھیس بدل لیا
تھا۔

راجہ بکرماجیت نے اپنی بیٹی کو بادشاہ کے ساتھ رخصت کیا اور بادشاہ
اپنے شہر پہنچ کر راج کرتا رہا۔

میں نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ
اس میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچ ہیں

میں نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ
اس میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچ ہیں
میں نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ
اس میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچ ہیں
میں نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ
اس میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچ ہیں
میں نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ
اس میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچ ہیں

میں نے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ
اس میں جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچ ہیں

پتھروں کی بارش

سرینگم سے جو بڑی سڑک جنوبی علاقے کو جاتی ہے۔ اس سڑک پر آپ کو ایک چوٹا سا پہاڑی نالہ دریا ئے جہلم کے ساتھ ملتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہاں ایک طرف تو حد نظر تک پھیلا ہوا ریتلا پاٹ ہے اور دوسری طرف وہ بڑے بڑے پتھر جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آج بھی اس ریت میں لوگوں کو پرانے زمانے کے سگے ملتے ہیں جن پر اس بادشاہ کی مہر ہوتی ہے جس کا دارالحکومت ان بڑے بڑے پتھروں کی بارش سے بہہ گیا تھا۔

یہ جگہ جو "رنب آر" کہلاتی ہے دراصل رمنیا (RAMANYA) کے نام کی بگڑی صورت ہے جس نے اپنے بھائی کی مدد کے لئے پہاڑوں سے یہ بڑے بڑے پتھر کٹھکائے تھے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رمنیا کی بھتیجی کو جو اس شہر کے ایک نوجوان شہری کی خوب صورت بیوی تھی، یہاں کا راجہ زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا اور اس بات کا انتقام لینے کے لئے رمنیا نے اپنے دیوتا بھائی سشروس ناگ کے ساتھ مل کر اس شہر کو غارت کیا تھا۔ اسی معدوم شہر کے ریتلے کنارے کہیں رمنیا کی

بھتیجی اُس نوجوان سے ملی تھی جو گندھارا دیس سے آیا تھا اور جس کے لئے سُشروس ناگ نے زامتر سر (ZAMTAR SAR) یعنی داماد کی جھیل بنائی تھی، جس کا دودھیا پانی آج بھی راہ گیروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ دُور دیس سے آئے ہوئے ایک نوجوان نے اس جگہ ایک لڑکی کو دیکھا جو جنگلی پھل چُن چُن کر کھا رہی تھی۔ نوجوان نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں، لڑکی بولی کہ جب کھانا میسر نہ ہو تو جنگلی میوے کھانے میں کیا تباہت ہے۔ رہا غربت کا سبب تو اُس کے متعلق ہمارے بابا بہتر جانتے ہوں گے۔

”کیا آپ کے باوا سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ نوجوان نے پوچھا۔ ”ہاں“ لڑکی بولی۔ ”مگر آپ اُن سے صرف تماشک کے میلے پر ملاقات کر سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور نوجوان سمجھ گیا کہ وہ پریوں کے دیس میں ہے۔ اب اُسے صرف تماشک یا ٹیکسلا کے ناگ میلے کا انتظار تھا۔ آخر میلے کا دن بھی آگیا اور دُور دُور سے آئے ہوئے لوگوں کی بھڑ میں پردیسی نوجوان نے اُسی لڑکی کو ایک ادھیر عمر کے آدمی کے ساتھ دیکھا۔ نوجوان نے جا کر سلام کیا اور باتوں باتوں میں اُس کی غربت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آدمی جو اصل میں ناگادوں کی مخلوق سے تعلق رکھتا تھا، بولا کہ وہ جو ایک جوگی درخت کے نیچے آسن جمائے بیٹھا ہوا ہے وہی ہماری غربت کا سبب ہے۔ یہ جوگی اصل میں ساری فصلوں کا رکھوالا ہے اور جب تک جوگی مخصوص منتر پڑھ کر نئی فصل کو ہاتھ نہ لگائے ہم فصلوں کے قریب نہیں جاسکتے۔ اگر آپ ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو ہم آپ کے اس احسان کا بدلہ ضرور چکا دیں گے۔

پردیسی نوجوان نے امداد کا وعدہ کیا اور وہ کسی نہ کسی طرح اُس جوگی کو ایسی روٹی کھلانے میں کامیاب ہو گیا جو نئی فصل کے اُٹنے سے پکائی گئی تھی۔ جو نہی

جوگی نے نئی فصل کی روٹی کا ایک نوالہ نکل لیا، آسمان پر کالے بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ناگوں نے بارش اور اُلوں کا وہ طوفان برپا کیا جس سے ڈھیروں اتاج پاتال پہنچ گیا۔ دوسرے ہی دن احتیاج کی ذلت سے آزاد ہونے کے بعد خوب صورت لڑکی کے باپ نے پردیسی نوجوان کو دعوت دے کر اپنے گھر بلایا۔ اور کئی روز اُس کی خاطر تواضع میں جُتارے۔ تب نوجوان کو اصل حقیقت معلوم ہوئی جب نوجوان نے رخصت طلب کی تو گھر کے مالک نے کسی چیز کی خواہش کے بارے میں پوچھا۔ نوجوان نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ سُسروس ناگ (SVSH RA - WAS NAG) نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس پردیسی نوجوان کے ہاتھ میں تھما دیا اور اُن دونوں کو اُس شہر میں رہنے کے لئے بھیج دیا، جسے بعد میں ناگ نے انتقاماً تباہ کر دیا تھا۔

ہوایوں کہ جب پردیسی نوجوان ناگ لڑکی کے ساتھ شہر میں آکر رہنے لگا تو لڑکی کے حسن و جمال کا شہرہ شاہی دربار تک پہنچا۔ پہلے تو حکمران نے لڑکی کو فریب دے کر ہتھیلیا لینے کی کوشش کی، اور سیدھے سبھاؤ کام نہ بنا تو دن دہائے پردیسی کے گھر پر ہلہ بول دیا۔

پردیسی نوجوان کسی طرح فریاد کرتا ہوا قریب کے اُن پہاڑوں کی طرف جا بھٹکا۔ جہاں اُس کے سسرال والے رہتے تھے۔ بس پھر کیا تھا، ناگوں کی فوج نے پورے شہر کو تاراج کیا اور اپنے پردیسی داماد کو لے کر "ناگ لوک" چلے گئے جہاں اُس کے لئے سُسروس ناگ نے ایک جھیل بنائی اور اُسے باقاعدہ ناگ برادری میں شامل کر لیا۔ جہاں شہر آباد تھا وہاں اب دُور دور تک ریت کے انبار ہیں یا وہ بڑے بڑے پتھر جو رَمبیا دیوی نے لٹھکائے تھے۔ اسی دیوی کے نام پر یہ نالہ آج تک رَمب آر (RAMBYAR) کے نام سے مشہور ہے۔

کچھ لوگ اسے نرپورہ بھی کہتے ہیں اور اس قدیم نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ
ریت سے برآمد ہونے والے سکوں پر حکمران کا نام نہ کھرا ہوا ہے۔

بھدرواہ

مغل بادشاہ اکبر اعظم اپنی مملکت کے دورے پر نکلا تو دوسرے راجوں مہاراجوں کی طرح بھدرواہ کا راجہ ناگ پال بھی سلامی کے لئے حاضر ہوا۔ اتفاق سے ایک کنویں پر راجہ ناگ پال اور اکبر اعظم کے سقے پانی بھرنے کے لئے ایک ساتھ آ پہنچے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پہلے پانی کون بھرے۔ باتوں باتوں میں بدلت بڑھ چلی اور راجہ کے ماشکی نے بادشاہ کے ماشکی کو اٹھا کر کنویں میں پھینک دیا۔ معاملہ اکبر اعظم تک پہنچا۔ راجہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ میرا ماشکی باسکی ناگ کی پوجا کے لئے پانی بھرنا چاہتا تھا اور اگر بادشاہ کا ماشکی پہلے پانی بھر لیتا تو پانی جو ٹھا ہو جاتا۔

اکبر اعظم نے کہا: ”کیا یہ باسکی ناگ کوئی ہم سے بھی بڑا بادشاہ ہے۔ ہم نے تو آج تک اس کا نام بھی نہیں سنا؟ راجہ نے جواب دیا: ”حضور! میں کل آپ کو باسکی ناگ کے درشن کراؤں گا۔ پھر آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے۔“

دوسرے روز جب راجہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا، تو اُس کی پگڑی سے پانچ سُرول والا ایک سانپ پھن پھیلائے کھڑا ہو گیا اور اکبر بادشاہ کے تخت کی طرف

چھپنے لگا۔

اکبر بادشاہ پانچ سردوں والے ناگ کو دیکھتے ہی سہم گیا اور راجہ سے کہنے لگا: "اُس بلا کو روک لو۔ اور مجھ سے جو کبھی چاہو مانگ لو۔" تب راجہ نے اکبر بادشاہ سے یہ رعایت مانگی کہ اُسے شاہی نوبت سجانے کا حقدار قرار دیا جائے۔ اُس دن سے لے کر آج تک بھدر واہ میں باسکی ناگ کی باؤلی پر برابر شاہی نوبت بجاتی ہے۔

راوی کہتا ہے کہ یہ وہی باشک یا باسکی ہے جس نے پُرانا زمانے میں کشمیر کی وادی سے بھاگ کر کملا س پہاڑ کی جھیل گنڈ کیپلس میں پناہ لی تھی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب بھدر واہ کے موجودہ قصبے کا کہیں نام و نشان موجود نہ تھا اور اس وادی کا مرکز نیسرو اور ہیلان ندیوں کے سنگم پر واقع قصبہ دوگھنگر تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس زمانے میں یہاں زبردست قحط پڑا، اور باسک ایک بھکاری کا روپ دھار کر قصبے میں خیرات مانگنے آیا۔ اُس نے ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن ہر جگہ سے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ آخر ایک بڑھیا کی کٹیا پر صدادی۔ بوڑھی عورت نے کہا کہ بیٹا اندر آ جاؤ۔ میرے پاس اور تو کھانے کو کچھ بھی نہیں صرف کچھ جنگلی بوٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ آؤ دونوں مل کر انہی بڑی بوٹیوں پر گزارہ کر لیں۔

مسافر اندر آکر بیٹھ گیا تو بڑھیا کی نظر اس کے پٹکے پر پڑی جس سے ٹپ ٹپ پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ جان گئی کہ اُس کا مہان کوئی بھکاری نہیں بلکہ باسک ناگ ہے۔ ناگ نے اپنا بھید کھلتے دیکھا تو بڑھیا سے کہا کہ خبردار جو تُو نے اس راز کا تذکرہ کسی اور سے کیا۔ اور یہ بات بھی اپنے تک محدود رکھنا کہ کچھ دنوں میں دو گھنگر غرقاب ہونے کو ہے۔

کچھ دنوں بعد ایک زبردست طوفان آیا اور پہاڑ پر ایسی بجلی گری کہ پانی کا ایک ہی ریلہ سارے قصبے کو بہا کر لے گیا۔ صرف ایک بڑھیا کی کٹیا تھی جو محفوظ رہی۔

یہ جو بڑے بڑے گول سے پتھر دوندیوں کے سنگم پر آج بھی موجود ہیں۔ یہ اُسی سیلاب
کی یادگار ہیں۔

ایک سُتار

راوی کہتا ہے کہ ایک شہر ہوا کرتا تھا۔ اس شہر میں ایک سُتار تھا جس کے بارہ سو (۱۲۰۰) شاگرد تھے۔ یہ سُتار شہزادی کے زیور تیار کیا کرتا تھا اور سُتار کی بیوی یہ زیورات لے کر شہزادی کے دربار میں حاضری دیا کرتی تھی۔ ایک دن شہزادی نے سُتار کی بیوی سے کہا کہ کل اپنے میاں کو بھیج دینا۔ سُتار سونے کی ایک انگوٹھی لے کر شہزادی کے دربار میں حاضر ہوا۔ شہزادی نے انگوٹھی کو ناپسند فرمایا۔ کہنے لگیں اس میں کھوٹ ہے۔ سُتار اپنے گھر واپس آ گیا اور آتے ہی بیمار ہو گیا۔ دراصل اُسے شہزادی سے عشق ہوا تھا اور شہزادی بھی اس کی محبت میں گرفتار تھی۔

شہزادی اپنی رضاعی ماں کی طرف مخاطب ہو کر کہتی ہے: (نظم)
 ”محمور آنکھوں والے زر گر پیٹے کو دیکھ کر میرا چین لٹ گیا ہے امی جان!۔
 (دودھ مان نے کہا، بیٹی بچوں والی باتیں نہ کر و جنجال میں گرفتار ہو جاو گی۔
 سُتار صاحبِ فراش ہے۔ اُسے عشق کا روگ لگا ہے۔ سُتار کی بیوی بہت عقلمند ہے، وہ سُتار کی اصل بیماری سے واقف ہو گئی۔ اس نے اپنے میاں سے کہا کہ تم غلیل

چلانا سیکھ لو، اور سونے کے دو ڈھیلے گھر لو۔ داستان گو کہتا ہے کہ سُنار نے سونے کے دو ڈھیلے تیار کئے اور ہاتھ میں کمائی لے کر ادھر ادھر کنکریاں پھینکتے ہوئے شاہی محل کی طرف چلنے لگا۔ شہزادی کے محل کی کھڑکی تلے پہنچ کر سُنار نے اپنی غلیل کی مدد سے سونے کے یہ دونوں ڈھیلے شہزادی کے کمرے کی طرف پھینک دیئے۔ دونوں ڈھیلے سیدھے شہزادی کے دامن میں جا گرے۔ جواب میں شہزادی نے سُنار کو آئینے کی پشت دکھا دی اور کھڑکی سے پانی نیچے پھینک دیا، ایک گلدستہ بھی اور اپنے سر کے اُچھے ہوئے بال بھی کنکھی سے نکال کر ایک گچھے کی صورت میں سُنار کی طرف نیچے پھینک دیئے پھر ایک سلائی لے کر کھڑکی کے ایک پٹ پر لیکر بھینچ دی۔ سُنار یہ ماجرا دیکھ کر منہ لٹکائے اپنے گھر آ گیا۔ بیوی نے پوچھا، کیوں بھی کیا تیر مار آئے ہو؟ سُنار نے سادگی سے جواب دیا۔ میں نے اپنی غلیل سے سونے کے دو ڈھیلے پھینک دیئے اور وہ دونوں شہزادی کی گود میں جا گرے۔ لیکن اُس نے مجھے اُٹا آئینہ دکھا کر کچھ پھول، کچھ سر کے بال اور پانی نیچے پھینکا، اور لوہے کی ایک سلائی لے کر کھڑکی پر ایک لمبی سی لیکر بھینچ دی۔ یہ سُن کر سُنار کی بیوی نے اپنے خاوند کو سمجھایا کہ بھولے آدمی! آئینے کی پشت دکھانے کا مطلب یہ ہو گا کہ اُس وقت اُس کی تنہائی میں کوئی ادھر آدی مغل ہو رہا ہے۔ پانی سے مُراد یہ تھی کہ باغ کی جو نالی محل کی دیوار کے تلے باہر بہتی ہے اُسی راستے سے تم باغ میں رات کو داخل ہو جانا۔ سلائی سے کھڑکی کو رگڑنے کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم کوئی ایسا ہتھیار ساتھ لے کر آنا جو لوہے کی سلاخوں کو کاٹ سکے تاکہ تم محل کے اندر آ سکو۔ سر کے بال کنکھی سے نکال کر باہر پھینکنے کا مطلب بھی یہی ہو سکتا ہے کہ میں ساز و سامان کئے بن سٹور کر بیٹھی رہوں گی۔

راوی کہتا ہے کہ شام کو سُنار اپنے گھر سے منزل مقصود کی جانب روانہ ہوا۔

باغ میں داخل ہوتے ہی ایک پلنگ پر نظر پڑی اور گھوڑے بیچ کر پلنگ پر سو گیا۔ رات کو شہزادی باغ میں پہنچی تو دیکھا کہ درگر بیٹا گہری نیند سو رہا ہے شہزادی نے بہتری کوشش کی کہ سنا کی آنکھ کھلے لیکن وہ گہری نیند سو رہا۔ صبح کو پوچھوٹنے لگی تو شہزادی اندر بھاگ گئی۔ سنا آنکھیں ملتا ہوا جاگا تو اسے بھی گھر کی راہ لینی پڑی۔ بیوی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا“ کہنے لگا۔ ”بیوی۔ شہزادی تو باغ میں نہیں آئی“

بیوی بولی۔ ”ذرا میرے قریب تو آؤ“ بیوی نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو سونے کے وہ دونوں ڈھیلے برآمد ہوئے جو سنا نے شہزادی کی طرف پھینکے تھے۔ اپنا سر پیٹ کے بولی کہ میاں شہزادی تو باغ میں آگئی تھی لیکن تم گہری نیند سوتے رہے۔ خیر اب جو شام کو دوبارہ جاؤ گے تو میں تمہیں سمجھا دوں گی۔

شام کو بیوی نے سنا سے کہا کہ اب جا رہے ہو تو یہ اپنے ناخن اُترواتے جاؤ۔ ناخن تراشتے ہوئے بیوی نے سنا کی انگلی کو نیرن سے کچھ اس طرح زخمی کر دیا کہ سنا چیخ پڑا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“ عاصم زادے مجھے ماں باپ نے نائیوں کے گھر ناخن اتارنے کی تربیت کے لئے کبھی نہیں بھیجا تھا۔“ بیوی بولی۔ ”خیر اب جو تم جا رہے ہو تو اس زخم کے لئے دوائی بھی ساتھ لیتے جاؤ۔“ یہ کہہ کر بیوی نے نمک اور باریک مرچوں کی ایک ایک چٹکی گئی پڑیا باندھ کر دی اور کہا کہ جب اس پلنگ پر تم شہزادی کا انتظار کرو اور درد کی وجہ سے زیادہ بے چین ہو جاؤ تو یہ چٹکی بھر دو انگلی کے زخم پر ڈال دینا۔ آرام آ جائے گا۔ سنا چل دیا اور دوائی ساتھ لے کر باغ میں جا پہنچا۔ شہزادی کے آنے میں تاخیر ہو گئی۔ سنا کی انگلی دکھنے لگی اور نیند نے غلبہ کیا۔ سوچنے لگا کہ شہزادی تو ابھی تک نہیں آئی اور میں درد کی وجہ سے ٹرپ رہا ہوں۔ کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ زخم پر دوا چھڑک کر تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں؟

زخم پر نیک اور بڑیوں کی چٹکی کا چھڑکنا تھا کہ سنا کر کو تارے نظر آنے لگے اور پلنگ سے اٹھ کر بین کرنے لگا۔ اتنے میں شہزادی بھی آگئی اور سنا را پنا در د بھول گیا۔ دونوں ملاقات میں محو رہے اور اسی عالم میں گہری نیند سو گئے۔

محل کے محافظوں کا معائنہ کرنے کے سلسلے میں کو تو ال کا گزر محل کے باغ کی اسی روش سے ہوا جہاں یہ دونوں بے سدھ ہو کر سو رہے تھے۔ کو تو ال نے دونوں کو گزرتا کر کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا کہ انہیں حوالات میں رکھا جائے۔ حوالات کے کمرے کے باہر کوئی مسافر جا رہا تھا۔ دونوں نے اُس سے کہا کہ شہر کے فلاں سنا کے گھر کی دیوار کے قریب جا کر ہانک لگانا کہ ”بادشاہ کی کیسر کیاری میں ایک گدھا گھس آیا تھا، نہ جانے اب زندہ رہے یا مارا اٹلے بادشاہ کی کیسر کیاری میں ایک گدھے نے منہ مارا اور گرفتار ہو گیا۔ اگر حیرمانہ لے کر جلدی سے گدھے کے وارث نہ پہنچے تو یقیناً وہ گدھا عاشق بادشاہ کے ہاتھوں مارا جائے گا۔“

جونہی یہ آواز سنا کر کی بیوی کے کان میں پڑی وہ فوراً بازار جا کر کچھ روٹیاں خرید کر لائی اور روٹیوں سے بھری ہوئی چھاڑی (بڑی سی چنگیر) جو کین سے بنی جاتی ہے، اُتر پڑا رکھ کر جیل خانے کی طرف چل دی۔ اور گانے لگیں۔

چھ قید خانوں میں روٹیاں بانٹ کر میں ساتویں قید خانے میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔ خدایا تو میری فریاد سن۔

واوی کہتا ہے کہ قیدیوں کو یہ کہہ کر روٹیاں بانٹی رہی کہ میرا خاوند بیمار ہے اور پیروں فقیروں نے کہا ہے کہ جیل خانے کے ساتویں کمروں میں رہنے والے قیدیوں میں خدا کے نام پر روٹیاں تقسیم کروں۔

لو یہ روٹیاں کھاؤ لیکن ایک بات پہلے سے کہہ دوں جو کچھ مجھ سے پوچھنا ہے اب جاتے ہوئے پوچھ لو۔ واپسی پر مجھ سے کوئی بات نہ کرنا کیوں کہ یہ میرے لئے بُرا

شگون ہوگا۔

سُنا کی بیوی اچانک اُن سے پوچھنے لگی۔ ”کوئی اور قیدی باقی تو نہیں رہا؟“ انہوں نے کہا کہ آج رات کے پچھلے پہر موٹے کوتوال نے دو قیدیوں کو گرفتار کر کے یہاں بھیج دیا ہے وہ دونوں قیدی پچھلے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ بھاگی بھاگی ان کے پاس پہنچی اور اپنے میاں سے کہنے لگی اب یہاں سے شہزادی کیسے رہا ہوگی؟۔ کیا شہزادی کو رہا کروا سکتے ہو؟۔ سُنا نے منہ لٹکا کر کہا کہ شہزادی کو رہا کرانے کے قابل ہونا تو خود قید میں گرفتار کیوں ہوتا؟۔

راوی کہتا ہے کہ ”سُنا کی بیوی نے اپنا لباس اتار کر شہزادی کو پہنایا اور اُس کے کپڑے خود پہن لئے اور خالی چھابٹری شہزادی کے سر پر اُلٹا کر رکھ دی۔ یوں شہزادی قید خانے سے نکل کر گھر کو چل دی۔ اُدھر صبح کو کوتوال نے بادشاہ کو رپورٹ دی کہ شہزادی اور شاہی سنا رات کو باغ میں سو رہے تھے جنہیں میں نے گرفتار کر لیا ہے۔ بادشاہ انصاف کے لئے دربار میں پہنچا۔ کوتوال نے دونوں قیدیوں کو دربار میں لانے کا حکم دیا۔ دیکھا تو دو میاں بیوی۔ سُنا کی بیوی نے ہاتھ باندھ کر بادشاہ سے گزارش کی کہ عالم پناہ! ہم میاں بیوی سر کرنے نکلے تھے کہ دیر ہو گئی ہم شاہی محل کے باغ میں داخل ہوئے، وہاں ایک پتنگ دیکھا اُس پر ستانے کو بیٹھے، اتنے میں آپ کا کوتوال آیا اور اُس نے ہمیں قید کر لیا۔ کوتوال نے بادشاہ سے کہا کہ عالم پناہ آپ کی بیٹی کو چاہیے کہ وہ ”دگنی ناگ“ (VIGNI NAG) پر جا کر قسم کھائے۔ روایت یہ ہے کہ جو اُس چشمے پر جا کر جھوٹی قسم کھائے گا وہ قسم کھاتے ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ سُنا کی بیوی اپنے میاں سے کہنے لگی۔ ”بولو۔ اب شہزادی کی جان بچا سکتے ہو۔ سُنا بولا کوئی راستہ دکھا دیے۔ کہنے لگی۔ اپنا سارا لباس بدل ڈالو۔ پاؤں میں کھڑاؤں پہنو، جسم پر بھبھوت ملو،

اور جوگی بن جاؤ۔ جس وقت شہزادی قُسم اُٹھوانے کے لئے چشمے پر پہنچائیں گے، تم بھاگ کر اُس کا دامن پکڑ لو اور خیرات مانگو۔ وہ تمہاری طرف دیکھ کر قسم کھائے گی کہ اے وگنی ناگ اس جوگی کے سوا آج تک کسی اور نے مجھ پاکدامن کا دامن نہیں پکڑا ہے۔ نظم :-

میں وگنی ناگ میں نہانے کے لئے اُتری تھی لیکن مجھے کیا معلوم کہ میرے سر اُس نے کون سا گناہ تھوپ دیا۔ ایک جوگی نے میرا ہاتھ تھاما، پھر اس کو توال کو کیا ہو گیا کہ میرے سچھے پڑا ہوا ہے؟ ایک دوسرے کو ملنے والے محبوب تو ملاقات کر کے اپنی اپنی راہ لگے، پھر یہ مٹا کو توال اب تک میرے سچھے کیوں پڑا ہے؟ اس کے بعد شہزادی ہنستے کھیتے اپنے گھر گئی سنار میاں بیوی اپنے گھر گئے اور کو توال کو پھانسی دی گئی۔

گھر جا کر سنار پھر بیمار ہو گیا۔ پھر عشق کا تاپ چڑھا۔ سنار کی بیوی عقل مند تھی اُس نے ایک بار بنایا۔ وہ بار اپنے میاں کی گردن میں ڈالا، اور اسے بنا سنوار کر ایک نوجوان تاجپننے والی لڑکی کے روپ میں تیار کر لیا۔ اور خود جوگی کا روپ بھار کر دونوں میاں بیوی بادشاہ کے ہاں پہنچے، جوگی نے بادشاہ سے کہا کہ میری یہ بھابی آپ کے سپرد ہے میں اپنے بھائی کے پاس جا رہا ہوں۔ اور اس رقاصہ کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ اس پاکدامن لڑکی کو شہزادی کے سپرد کر دیجئے۔ یہ اس رچا کر سنار کی بیوی اپنے گھر آگئی اور کچھ دن بعد سنار بھی آنکھ بچا کر اپنی بیوی سے جا ملا۔

راوی کہتا ہے کہ ایک دن دونوں میاں بیوی بھیس بدل کر پھر شاہی محل کے باہر جا پہنچے۔ خاوند کو سوداگر کے بھیس میں ایک خیمے میں بٹھا کر سنار کی بیوی جوگی بن کر بادشاہ کے پاس پہنچی اور مطالبہ کیا کہ میری رقاصہ کو میرے حوالے کر

دیکھئے۔ جوگی کے روپ میں دھونی رمائے سُنار کی بیوی بس ایک ہی رٹ لگائے
ہوئے تھی کہ مجھے اپنی رتاقصہ واپس چاہیئے۔ نظم :-

”سارا دن انتظار میں گزرا، سنیا سی اپنی رتاقصہ کی تلاش میں آیا ہے“ بادشاہ
نے جواب دیا، ”میاں سنیا سی۔ ہنگامہ نہ کرو، میں تمہیں تادان کے طور پر ایک
خاتون دینے کو تیار ہوں۔“

جوگی نے کہا کہ میں ایک بے بس سنیا سی سہی لیکن اپنی پاکدامن بھابی کے بدلے
میں صرف شہزادی کو ہی قبول کر سکتا ہوں۔ اور اس کے گلے میں ایک سوا شرفیوں
کا دلیسا ہی ہار ہونا چاہیئے۔

راوی کہتا ہے کہ بادشاہ نے سوا شرفیوں کا ہار اپنی بیٹی کے گلے میں ڈالا، اور
اُسے سنیا سی کے سُپرد کیا۔

یوں سُنار کی بیوی نے شہزادی کو حاصل کر کے یہ کہہ کر اپنے میاں کے سُپرد کیا
کہ لومیاں — تم جاتو اور یہ جانے۔

یقیناً ایسا کارنامہ ایک عورت ہی انجام دے سکتی ہے۔

بانسری

- ۱۔ جس پر بیٹے کی۔ اُس کی بیٹا ساٹ پر دوں سے بھی ظاہر ہو کر رہتی ہے بانسری کی بیٹا وہ خود اپنی زبانی کہہ رہی ہے۔
- ۲۔ بانسری کہتی ہے کہ مالک تو صرف ایک ہے جو غصے اور نفرت سے پاک ہے۔
- ۳۔ بانسری کہتی ہے کہ خدا کی ذات تمام آلائشوں سے پاک ہے یہ دن رات جو خود ایک دوسرے کے چکر میں ہیں اسی ذات واحد کے مشتاق ہیں۔
- ۴۔ اس خدا کا شکر کر د جس نے اپنے پیارے نبی (محمدؐ) کو پیدا کیا۔
- ۵۔ اُس کی مصاحبت کے لئے چار یار بھی پیدا کئے۔
- ۶۔ اُس کے نور سے تو آدمؑ پیدا ہوا اور آدم کے ساتھ یہ دنیا (وقت)۔
- ۷۔ بانسری کہتی ہے کہ آدم کو تو پیشوا پیدا کیا گیا تھا لیکن مشیت کا تقاضا تھا کہ آدم ہی کی پسلی سے اماں حوا پیدا ہو۔
- ۸۔ بانسری اُس نیک ساعت کو یاد کرتی ہے۔ جب اللہ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔

۹۔ اب بانسری اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اگر کوئی دل والا ہے تو میری سر یاد سن لے۔

۱۰۔ بانسری کہتی ہے کہ میں دُور جنگلوں میں برگ بار کے کہنوں میں دھن کی طرح بن سورا کر رہتی تھی۔

۱۱۔ بانسری کہتی ہے کہ میرا بچپن کتنا بلند قد آ رہا تھا اور میں اپنے کانوں میں سونے کے آدیزے پہنے ہوئے کتنا اترا تھی پھرتی تھی۔

۱۲۔ یہ اُسی اترنے کا اور گھنٹہ کا بدلہ ہے کہ مقدر ایک کلہاڑی والے قاتل کا روپ دھار کر مجھ تک آ پہنچا۔

۱۳۔ یہ میرے اُسی قصور کی سزا تھی کہ کلہاڑی کو دیکھنے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔
۱۴۔ وہ خونخوار آدمی مجھ پر کلہاڑی سے وار کرتا، اور میرے بدن کو گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی طرح کاٹا چلا گیا۔

۱۵۔ مجھ میں کس قدر گھمنڈ تھا۔ میں اپنے قد سے کتنی اونچی ہو رہی تھی اور اب اسی غرور کی یاداش میں یہ کلہاڑی والا آدمی میری جوانی کو کیسے مٹی میں ملا رہا ہے۔
۱۶۔ یہ اسی جدائی کا ہنگامہ ہے جو بانسری جنگل سے وداع ہوتے وقت جدائی کے درد سے برپا کر رہی ہے۔

۱۷۔ بانسری کہہ رہی ہے کہ مجھے جنگل سے گھسیٹ کر لانے کے بعد اس کلہاڑی والا آدمی نے ایک سنجار بڑھئی کے سپرد کر دیا۔

۱۸۔ اب یہ بڑھئی مجھے گھوم پھر کر ہر پہلو سے دیکھ رہا ہے اور دیکھنے کے بعد.....
میری کانٹ چھانٹ میں مصروف ہو جاتا ہے۔

۱۹۔ بانسری کہتی ہے کہ آرے سے چیرنے کے بعد مجھے سنجار نے چرنے پر چڑھا دیا۔

۲۰۔ چرنے کے چکرنے بانسری کو اپنے وہ ساتھی یاد دلانے جو دُور جنگل میں رہ گئے

تھے۔ ۱۔ اپنے ان ساتھیوں سے بانسری کچھ کہنا چاہتی ہے! بھلا کیا کہے گی؟
 ۲۰۔ بانسری کہتی ہے کہ میرے وہ ساتھی کیا ہوئے؟ میں انہیں تلاش کرنا چاہتی ہوں،
 وہ کہیں راستے ہی میں تو نہیں رہ گئے؟

۲۱۔ میں اپنے ان ساتھیوں کو اپنا سینہ پیر کر دکھاتی اور اپنے راز سے آگاہ کرتی۔
 ۲۲۔ میرا یہ کیا حال ہوا ہے اور میں کیوں فریاد کر رہی ہوں۔ کیا صرف اپنے لئے، کیا
 یہ صرف مجھ ہی پر مبنی ہے؟

۲۳۔ بانسری کہتی ہے کہ میں بھری بزم میں فریاد کرنا چاہتی ہوں۔ میں سب لوگوں
 سے کہنا چاہتی ہوں کہ دکھ اور درد کے بغیر کوئی عورت، کوئی مرد اس دنیا
 میں کوئی نہیں ہے۔

راوی کہتا ہے کہ بانسری اپنے ساتھیوں سے کہنا چاہتی ہے کہ
 ۲۴۔ ذرا دیکھو تو مجھے نرم کر کے نقاش نے میرے جسم میں کیسے زخم اور کیسے سوراخ
 کر دیئے۔ ذرا دیکھو تو سہی میرا گوشت میری ہڈیوں سے کس طرح اُناڑا جا رہا ہے؟
 ۲۵۔ میں فریاد کیوں نہ کروں میرا جسم چھلنی ہو گیا ہے۔ اور میں کیوں نہ ماتم کروں کہ میرا
 ”خالق“ چند کھوٹے سکوٹ کے عوض مجھے بیچ کر سکوٹ کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہے۔
 راوی کہتا ہے کہ کھوٹے سکوٹ کے عوض بک جانے کے بعد اب بانسری کو اپنا
 نیستان یاد آ رہا ہے اور اپنے اس مسکن کی طرف بانسری کچھ کہہ رہی ہے۔
 ۲۶۔ بانسری کہتی ہے کہ میرے دل میں اُسی نیستان کی آرزو ہے جہاں میں پیدا ہوئی
 اور اُسی مقام کے لئے میں بھٹک رہی ہوں۔

۲۷۔ میرا نیستان کتنا اچھا ہے اس بات کا اندازہ کسی بھی ناواقف شخص کو کیسے
 ہو سکتا ہے؟

۲۸۔ میرے اس مقام سے کوئی بے خبر آدمی کیسے واقف ہو سکتا ہے۔

- ۲۹۔ بانسری کہتی ہے کہ اس مقام کی اصل تو صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے، جو
مکان سے لامکاں تک کا سفر کر چکا ہو۔
- ۳۰۔ بانسری کہتی ہے کہ مولینا نے کیا اچھی مثنوی کہی ہے لیکن یہ بات تو وہ جانے
جسے عشق کے آزار کا تجربہ ہو۔
- ۳۱۔ بانسری کہتی ہے کہ میٹھی شراب تو کئی لوگ پی رہے ہیں لیکن تلخ دوائی کا یہ
جام دُور سدرہ بل کے مقام پر سبھان (شاعر) اکیلا ہی پی رہا ہے۔

اکھوتا بیٹا

روایت ہے کہ جس جگہ اب دُگر جھیل واقع ہے، وہاں کسی زمانے میں ایک قصبہ آباد تھا جس میں طرح طرح کے لوگ رہتے تھے کوئی امیر تھا، کوئی غریب۔ لیکن سب لوگ صحت اور اولاد کی دولت سے مالا مال تھے۔ مائیں اپنے بیٹوں پر فخر کرتی تھیں تو بہنوں کو اپنے بھائیوں پر ناز تھا مگر ایک گھر ایسا بھی تھا جسے آخرت میں بخشش کی کوئی اُمید نہ تھی۔ دونوں میاں بیوی گھر میں اپنی سات بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے اور اپنے نصیب کو کوسنے رہتے تھے۔ منتیں مانیں، پڑھانے پڑھائے، جو پونجی بیٹیوں کے کام آتی وہ جو تیشیوں کی نذر کرتے رہے، لیکن کوئی چیز کام نہ آئی۔ ہمسائے منحوس سمجھ کر کئی کراتے رہے اور جو تیشیوں نے بھی آئندہ کچھ دان پُن ملنے کی اُمید چھوڑ کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان دونوں میاں بیوی کے پچھلے جنم کے گناہ اتنے زیادہ ہیں جن کا بوجھ اُٹھانا اولادِ نرینہ کے بس کی بات نہیں، اس لئے انہیں اگلے جنم میں بھی سزا سے نجات دلانے والے کسی بیٹے کی پیدائش کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ حالت دیکھ کر دونوں میاں بیوی دن رات ایک دوسرے سے چُپ چُپ کر آنسو بہاتے اور ساتوں لڑکیاں کونوں کھڑوں

میں منہ چھپائے رہتیں کہ ماں باپ انہیں دیکھ کر ادبھی رنجیدہ نہ ہوں۔ تب رحمتِ حق کو جوش آیا اور ایک جوگی اچانک اس دیران گھر میں کہیں سے آنکلا۔ جوگی نے کہا: ”سات بیٹیوں کی ماں! تجھے بیٹا چاہیے نا؟ مل جائے گا لیکن اس شرط پر کہ تو اُسے بارہ برس تک میری امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھے گی۔“ متنا کی ماری رد کر بولی کہ جوگی جی میں اُسے ساری عمر آپ کی امانت سمجھ کر پاس رکھوں گی بس ایک بار میری یہ حسرت پوری کر دیجئے! — پورے نو مہینے نو دن اور نو ساعتیں گزرنے پر اس دیران گھر میں بہار آگئی، اور ”اکھوتا بیٹا“ یا کہ نندنُ چاند سورج کو شرماتا ہوا آیا — باپ کو یہ حقیقت جاگتی زندگی جیسے ایک خواب محسوس ہوتی تھی۔ ماں جوگی کی امانت کو کسی طرح اپنی گود سے الگ کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھی اور ساتوں بہنیں ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتی تھیں کہ کون اپنے بھیا کو جان سے بھی زیادہ پیارا سمجھتی ہے — یوں پلک جھپکنے میں بارہ برس بیت گئے۔ اب کہ نندنُ باقاعدہ مدرسے میں سبق پڑھنے لگا اور گھر کے نو افراد تو خود کو جیسے نو نندنُ کا شاہی خاندان سمجھتے تھے۔ پھر بھلا جوگی کو کون یاد رکھتا۔ گھر میں سب لوگ کہ نندنُ کی کسی شرارت کو یاد کر کے قہقہے لگا رہے تھے اور سب کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ لڑکائیں اب مدرسے سے واپس آیا ہی چاہتا ہے۔ اتنے میں دروازے پر مست المست جوگی کی آواز گونجی — جوگی کی آواز سن کر ماں دروازے کی طرف لپکی، اور ساتوں بیٹیاں باورچی خانے میں چلی گئیں۔ جوگی کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے اور آواز کسی شعلے کی طرح لپک رہی تھی۔ اُس نے لٹکار کر کہا — ”میری امانت میرے حوالے کر دو۔“ ماں بولی — ”جوگی جی آپ تشریف تو رکھیے کہ نندنُ مدرسے سے بس ابھی آتا ہی ہو گا۔“ ”نہیں تم اُسے چھپا رہی ہو۔“ ساتوں لڑکیاں اُسے مہندی رچا کر دُلہا بنا رہی ہیں — وہ رہا — ”ماں نے دیکھا کہ کہ نندنُ جیسے دُلہا بن کر کمرے سے نکل کر جوگی کی طرف آ رہا ہے۔“

جوگی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ ہا ہا۔ آج ہم سب لوگ دعوت اڑائیں گے۔
 ہاں بھئی گھر والو۔ دیگیں چڑھاؤ، آج اکہ نندن کا گوشت ہم سب لوگ مل کر کھائیں گے۔
 اس کے بعد کسی کو نہیں معلوم کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے، گھر کے سب لوگ چلتے پھرتے
 سائے نظر آئے تھے اور کھٹ پٹیوں کی طرح جوگی کی ڈور پر حرکتیں کر رہے تھے۔ بہنیں
 چوہا جلا رہی ہیں، باپ جوگی کے ہاتھوں سے گوشت کے ٹکڑے پھوڑ کر دیگ میں ڈال
 رہا ہے اور ماں دیگ پکا رہی ہے..... جوگی گھوم پھر کر ہدایات دے رہا ہے۔
 دیکھنا مائی دیگ ہلکی آہنچ پر رہے۔ لڑکیو، نمک مریج برابر ہو، اور اپنے باپ
 سے کہہ دو کہ گوشت ہویا ہڈی لڑکے کے جسم کا ایک بھی ٹکڑا ضائع نہ ہونے پائے.....
 سائے حرکت کرتے رہے اور کھٹ پٹیوں کا یہ تماشا ناٹک منڈلی میں چپ چاپ جاری
 رہا۔ تب جوگی خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ہاں اب بات نبی، اب صرف گیارہ
 تھاں چاہئیں۔ فرش پر بچھونا بچھایا گیا، اور گیارہ آدمیوں کے لئے کھانے کے تھاں
 قرینے سے رکھے گئے۔ کھانا چنگا گیا۔ جو صرف اکہ نندن کے گوشت پر مشتمل تھا۔
 کمرے میں خاموشی کا ایک طویل وقفہ جوگی کی لکڑا پر ختم ہوا۔ اکہ نندن کو آواز دو۔
 ماں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پکارنا چاہا لیکن لفظ جواب دے گئے اور صرف چیخ کی
 آواز سنائی دی۔ ”یوں نہیں“ جوگی بولا۔ باہر دروازے پر جا کر گلی میں زور سے
 آواز دو..... لڑکھڑاتے ہوئے ماں نے دروازے پر پہنچ کر بیٹے کا نام پکارا۔
 ”جی امی! آ رہا ہوں“۔ دُور سے آواز آئی۔ امی بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے
 جلدی سے کھانا کھلائیں..... یہ کہتے ہوئے اکہ نندن صحن سے ہڑتا ہوا رسوئی کی طرف
 جانے لگا۔ ماں نے مڑ کے دیکھا، کہاں کا جوگی اور کس کی دعوت۔ سب لوگ گھر
 میں بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ اکہ نندن کھانا مانگ رہا تھا۔

دردستان کا ترک

اگر دردستان کا سردار پندارک چشمے میں تیرتی ہوئی پیاری مچھلی کے جسم میں اپنے
 نیزے کی آنی نہ جھونکتا تو اُس کا سر جنگ کے میدان میں یوں جسم سے جدا نہ ہوتا۔
 یہ اُس زمانے کی بات ہے جب درد قوم کے سردار نے وادی پر حملہ کیا۔ حملہ آور
 سرحد کے ایک اہم گاؤں تک پہنچے تھے اور یہ بات طے تھی کہ اگلی صبح کو فیصلہ کن جنگ
 ہوگی۔ لیکن تقدیر کا مارا درد سردار اُس چشمے کی طرف شام کو سیر کرتے ہوئے جا نکلا جو
 پندارک ناگ کہلاتا ہے۔ ہر چند کہ لوگوں نے اُسے منع کیا لیکن درد سردار نے چشمے میں
 تیرتی ہوئی ایک خوب صورت مچھلی کو ہلاک کرنا چاہا۔ سردار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مچھلی
 پر نیرہ پھینکا۔ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ چشمے سے ایک گیدڑ نکل آیا، اور
 درد سردار نے اندھا دھند اُس کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ وہ شاہی لشکر کے زرنے
 میں آگیا اور شاہی فوج نے درد سردار کا سرتن سے جدا کر کے حملہ آوروں کو اپنے ملک
 سے مار بھگایا۔ اس غیبی فتح کا سہرا پندارک ناگ کے مر باندھا جاتا ہے۔ درد
 دردوں کی بہادری سے کون واقف نہیں۔ اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ ہمارے

کئی جاگیر دار بھی دروزوں سے درپردہ ملے ہوئے تھے۔ اسی لئے تو چشمے کی مچھلی
کا شکار حرام ہے۔

موتل ہامہ کا خوب

یوں تو موتل ہامہ کا ہر باشندہ شیخ چلی ہے لیکن ان کا نمبر دار شیخ چلی کا بھی سردار نکلا۔ گاؤں کے لوگوں سے مشورہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی دوسرے گاؤں سے ایسی بیوی بیاہ کر لائی جائے جو عقلمند ہو تاکہ اس کے بطن سے عقلمند اولاد پیدا ہو، اور اس طرح پیدائشی بیوقوف ہونے کا وہ داغ دھل سکے جو موتل ہامہ کے گاؤں پر ہمیشہ سے لگا ہوا ہے۔ تجویز تو اچھی تھی مگر اس پر عمل کیسے ہو جبکہ اس پاس کا کوئی گاؤں والا بھی اپنی بیٹی ان روایتی بیوقوفوں کے پلے باندھنے کو تیار نہ تھا مگر یہ لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ ہر دوسرے روز ایک وفد تیار کرتے جو کسی گاؤں میں نمبر دار کی رشتہ مانگنے جاتا اور مار کھا کر واپس لوٹتا تھا۔ ہوتے ہوتے ان حماقتوں کی کہانی دُور دُور تک پہنچی اور وہ جوانسوں کی ایک تیسری جنس پانچ آدمیوں کو ساتھ لے کر گاؤں گاؤں مار سٹگھا کر کے ناجیتی پھرتی ہے، اُن میں سے ایک نوکر فتار کو بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ یہ جو ہم گھر گھر لوگوں کی خیر مانگتے اور گانا گاکر پیٹ بھرتے ہیں کیوں نہ ہم موتل ہامہ کے گاؤں جا کر وہاں کے نمبر دار کی بیوقوفی سے فائدہ اٹھائیں اور کچھ دن آرام سے بسر کریں۔

یہ سوچ کر وہ آدمی موکل حامد کے مبردار سے ملنے کے لئے گیا اور انتہائی رازدارانہ
 لہجے میں اُس سے کہا کہ میں نے فلاں گاؤں میں آپ کے لئے دُھن تلاش کی ہے، وہ
 آپ کے نام کی شہرت سُن کر آپ پر عاشق ہو گئی ہے لیکن گاؤں والے اس کے تمام گھر
 والوں کو اس "جرم" کی پاداش میں اپنی بستی اور برادری سے خارج کرنے پر تِلے ہوئے
 ہیں۔ آپ کی نادیدہ محبوبہ کے چار بھائی ہیں اور ایک اُمی جو دُور کے رشتے سے میری
 خالہ لگتی ہیں۔ اگر آپ ہم سب لوگوں کو اپنے گاؤں میں پناہ دیں تو میں سارے قافلے کو
 لے کر آجاؤں۔ مبردار بہت خوش ہوا، اور مہانوں کے لئے گھر کی سجاوٹ میں مشغول
 ہو گیا۔ اُدھر تیسری جنس کے ساتھیوں نے ایک نوجوان فاحشہ عورت کو اس بات پر
 آمادہ کر لیا کہ وہ اس ملی بھگت میں اُن کا ساتھ دے۔ یوں سات افراد کا یہ ٹولہ مبردار
 کے گھر میں آدھکا اور مزے مزے کی دعوتیں اُڑاتا رہا۔ دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے مبردار
 نے اپنے پُرکھوں کی عظمتوں کا بیان شروع کر دیا تو آکتا ہٹ کی ماری فاحشہ عورت
 کے مُنہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ "یقیناً بے وقوفوں کی اولاد بھی بیوقوف ہوتی ہے"
 اب یہ محض اتفاق تھا یا مبردار کے عشق کی کرامت کہ یہ جملہ اُس کے دل پر تیر کی طرح
 نشانے پر جا لگا۔ مبردار کئی دن تک سوچتا رہا اور اُس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا
 گیا۔ آخر فاحشہ عورت بولی کہ میرا سب سے جھوٹا بھائی جو میرا پیغام لے کر تم تک
 آیا تھا، سب سے زیادہ ذہین ہے تم اسے اپنا بیٹا بنا لو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے لئے
 تمہیں فوری طور پر کھانا پڑھائی کرنی ہوگی اور باضابطہ سرکاری کاغذات مکمل کرنے ہوں گے۔
 مبردار کے لئے یہ کون سی مشکل بات تھی اُس نے فوراً تمام کارروائی مکمل کر لی اور
 اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد منہ بولے بیٹے کے نام منتقل کر کے اُسے اپنا وارث
 اور جانشین مقرر کیا۔ کچھ مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن اس چالاک ٹولے
 سے اب مبردار کی بیوقوفی بڑاشت نہیں ہو پاتی تھی اور اس سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر

غزوری تھی۔ یہ تدبیر فاحشہ عورت نے یوں عمل میں لائی کہ ایک دن سارے گھاؤں والوں کو نمبردار کی بیٹھک میں جمع کیا اور دو قد آدم آئینے گھر میں اس ترتیب سے رکھ دیئے جن میں اندر آتے اور باہر جاتے ہوئے آدمی کا عکس دیکھنے والوں کو اچھی طرح نظر آئے۔ دونوں آئینوں پر پردے لٹکا کر فاحشہ عورت نے گھاؤں والوں سے کہا کہ میں اس گھاؤں کی ٹری بہو ہوتے ہوئے یہ اندھیر برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے دو شوہر ہوں، اور آپ کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ یہ کہہ کر اُس نے نمبردار کو آئینوں کے سامنے سے گزرنے کو کہا تو لوگوں نے آئینوں میں ایک ہی شکل کے دو آدمیوں کو اندر آتے اور باہر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ فاحشہ عورت چیخ کر بولی کہ اے گھاؤں والو! اگر تمہارے نمبردار میں ذرہ بھر بھی غیرت ہے تو اُسے ابھی بھاگ کر سامنے بہتے ہوئے دریا میں ڈوب مرنے چاہیے۔ "یقیناً۔ ضرور۔ بے شک"۔ سب لوگوں نے فاحشہ عورت کی تائید کی۔ اور نمبردار ان آوازوں سے پہلے ہی دُور کر دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ یوں متلِ حامد کو ایک "عقل مند" نمبردار بھی مل گیا، لیکن ان عقل مندوں کی شہرت میں کوئی بھی فرق نہیں آیا۔

سونے کی کان

روایت ہے کہ کشمیر کے کرکوٹہ خاندان کے ایک حکمران نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ چہرے پر تو پریشانی کے آثار ہیں لیکن ایک ستھیلی پر سونے کی ڈلی اور دوسری پر تانبے کی ڈلی لئے ہوئے حکمران کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ تب اس شخص نے قریب آکر حکمران سے کہا کہ میں دُر جھیل میں، جسے پرانے زمانے میں مہاپدم سر کہا کرتے تھے، صدیوں سے امن و سکون کی زندگی گزار رہا ہوں، لیکن آج میری زندگی خطرے میں ہے کیونکہ ایک غیر ملکی جادوگر جو دراوڑ دیش سے آیا ہے مجھے منتر پھونک کر تپتے ہوئے صحراؤں میں لے جانا چاہتا ہے۔ یہ غیر ملکی جادوگر پیسے کمانے کے لالچ میں مجھے پرانے لوگوں کے سامنے تماشا بنانے کا اور مجھے یہ ذلت گوارا نہیں۔ اگر آپ مجھے اس جہنمی سپیرے سے نجات دلائیں تو میں آپ کو اپنی اس سرزمین میں ایک ایسے پہاڑ کا پتہ بتا دوں گا جہاں سونے کی ایک بہت بڑی کان ہے۔ خواب سے بیدار ہو کر کشمیر کے حکمران نے ہر طرف پیامے دوڑائے اور دراوڑ سپیرے کو گرفتار کر کے دربار میں لایا گیا۔ سپیرے سے سوال کیا گیا کہ وہ اتنی بڑی جھیل سے اتنے بڑے سانپ کو کیسے پکڑے گا

تو سپیرالو لاکہ وہ جادو کی قوت سے یہ کرشمہ دکھانے کو تیار ہے۔ تب اُس نے جھیل کے کنارے جا کر مناسب منٹروں کی قوت سے چاروں طرف تیر چلائے اور جھیل کا پانی اُترتے اُترتے تہہ تک پہنچ گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ انسانی صورت کا ایک بالشت بھر سانپ دوسرے سانپوں کے درمیان کھیچڑ میں بل کھا رہا ہے۔ سپیرے نے کہا کہ حضرات آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے سانپوں کے اس بادشاہ کو جادو کے زور سے اتنا بے بس کر دیا ہے کہ اب میں اسے آسانی سے پکڑ سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر سپیرالٹیری سے سانپ کو پکڑنے کے لئے جھیل کی طرف جانے لگا لیکن سہارے اُسے ایسا کرنے سے منع کیا۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سپیرے نے منٹروں کا آثار شروع کیا اور جھیل پہلے کی طرح پھر پانی سے بھر گئی۔

سپیرال انعام و اکرام لے کر رخصت ہوا تو حکمران سوچنے لگا کہ کاش مہاپدم سر دروگر جھیل کا ناگ مجھے ابھی اُس پہاڑ کا پتہ بتلا دے جہاں سونے کی کان واقع ہے۔ لیکن دن کی روشنی میں یہ ممکن نہ تھا، اسی تصور میں حکمران کی آنکھ لگ گئی تو اُس نے پھر ناگ کو انسانی شکل میں خواب میں یہ کہتے ہوئے پایا کہ ”میں کس عنایت پر ایسے کرم فرماؤ کہ سونے کی کان کا پتہ بتلاؤں جس نے مجھے بھری محفل میں رسوا کیا ہو؟“..... میں پرانے لوگوں کے ہاتھوں رسوائی کے خوف سے اپنے دیس کے رکھوالوں سے امداد کا طالب ہوا۔ لیکن میری حفاظت کا یقین دلانے کے باوجود مجھے سر عام رسوا کیا گیا..... رعایا کی نظروں میں حاکم سمندر کی طرح بے پایاں اور ناتاہل تسخیر ہوتا ہے لیکن ایسے حاکم کی رعایا کی نظروں میں کیا خاک عزت ہوگی جس کے سامنے رعایا کو کسی دوسرے جابر کے ہاتھوں ندامت اٹھانی پڑے؟ — یقیناً مجھے حاکم نے ایک اجنبی کے بچے سے محفوظ رکھا لیکن مجھ میں وہ پہلی سی عزت نفس کہاں باقی ہے کہ میں اپنے کنبے اور اپنی ان عورتوں کی نظروں میں مقبر کہلا سکوں گا جن کی حفاظت میرا فریضہ ہے۔“..... مہاپدم ناگ نے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے چند لمحے

خاموشی اختیار کی اور اس کے بعد نرم اور اُدا س لہجے میں خود کلامی کے انداز میں بولا کہ
 ”غیر ایسے حکمرانوں کے لائے ابالی روئیے پر حیران ہونے کی کیا بات ہے جو انجام کو دیکھے
 بغیر کسی کام کا حکم جاری کرنے کے عادی ہوں..... ایسے حکمرانوں کے نزدیک تو
 صاحبِ فہم لوگوں کی تذلیل کرنا محض ایک کھیل ہے حالانکہ حکمرانوں کی یہ دل لگی
 فہم و فراست رکھنے والے لوگوں کے لئے اذیت ناک موت سے کم نہیں.....
 اور میں اذیت کی اس موت کا شکار ہونے کے باوجود آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا
 — سونے کی کان کے لئے جو ظرف چاہیئے وہ یہاں موجود نہیں، پتھر بھی میں جاتے
 جاتے تانبے کی ایک کان کا پتہ بتلا دوں جو راجوری کی طرف اُس پہاڑ میں واقع
 ہے۔“ یہ کہہ کر ناگ نے خواب میں وادی کے حکمران کو ایسے اشارے دیئے
 جن سے تانبے کی کان کا سراغ لگانا بہت آسان تھا — اور کچھ دنوں بعد
 تانبے کی اس عظیم کان کا سراغ مل گیا۔

Handwritten text in Devanagari script, appearing as bleed-through from the reverse side of the page. The text is arranged in approximately 10 horizontal lines, though the characters are faint and difficult to decipher.

یوسف زلیخا

(کورس) اے دوست! یوسف زلیخا کی داستان سُن لے۔

(زلیخا کہتی ہے)

”تم میری دعوت قبول نہیں کر دگے یوسف۔ کبھی کبھار تو آیا کرو!“

(کورس): یوسف زلیخا کی داستان سُن لے....

زلیخا: میرے محل کے سات ایوان ہیں، یہ سب تیری دید کے منتظر ہیں۔ پل بھر

یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔

(کورس): داستان سُن لے.....

(راوی) اپنے بہت خانے کو زلیخا نے ڈھانپ لیا

..... داستان سُن لے۔

(یوسف کہتا ہے) ”وہاں کیا چھپا رکھا ہے، میں کیوں نہیں دکھاتیں؟“

(زلیخا کہنے لگی) ”یہ تو میرا خدا ہے۔“

(کورس) داستان سُن لے۔

یوسف کہتا ہے، ”خدا تو وہی ایک ہے۔ اپنے دل سے دُئی کو نکال لے خدا تو ایک شمع کی طرح روشنی بختا ہے۔“
(کورس) داستان سُن لے۔

خدا تو وہی ہے جس نے اپنے جلوؤں سے اس عالم کو آشکار کیا۔ بھلا کہیں پتھروں سے بھی تیرا مدعا پورا ہو سکتا ہے؟
حضرت یوسف دامن چھڑا کر بھاگ گئے اور زلیخا ان کے تعاقب میں ہے۔
یوسف بھاگ رہا ہے اور زلیخا پیچھے دوڑ رہی ہے۔ کہنے لگی: ”بھئی یہ کوئی بات ہے بھلا؟“
(آخر) یوسف کا گریبان پکڑ کر زلیخا انہیں بادشاہ کے سامنے لائی۔
راوی کہتا ہے کہ:

”حکمان عزیز مہر کو حضرت یوسف سے پر خاش تھی۔
اب یوسف قید میں ہے اور کوئی نہیں سُنتا۔ رہائی اللہ کی طرف سے ہوگی۔
جب یوسف کو قید خانے میں ڈال دیا گیا تو وہاں برسوں پہلے قیدیوں نے
کچھ خواب دیکھے۔ صبح کو ایک قیدی نے اپنا خواب بیان کیا، تو حضرت یوسف
نے اس قیدی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ بادشاہ کے حکم سے تم قتل کئے جاؤ گے اور
اُسے بادشاہ نے مردِ اڈالا سودرے قیدی کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے حضرت یوسف
نے اُس سے کہا کہ:

”تم بادشاہ کے پیش کار بنو گے۔ لیکن دیکھنا ہمیں بھول نہ جانا۔
قیدیوں نے خواب دیکھے اور مڑے کی تعبیریں پائیں وہ دوسرے ہی دن رہا
ہو گئے۔“

(کورس) داستان سُن لے۔

راوی: اب بادشاہ - عزیزِ مصر خواب دیکھتا ہے -
بادشاہ خواب دیکھ کر پریشان ہو گیا، اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔
ہنگامہ کس بات کا؟

یہ جو سارے مُلا، بابا، پیر اور فقیر موجود ہیں اور کوئی بادشاہ کے خواب کی تعبیر نہیں
بتا سکتا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان ملاؤں، باباؤں، پیروں اور فقیروں کے بدلے
صرف ایک حکمت والا (دانا) پیدا ہو.....

کس بات کا حکیم؟ جو بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتا دے -
ایک غلام نے عزیزِ مصر سے کہا کہ خواب کی تعبیر بتانے کے ماہر حضرت یوسف ہیں۔
خواب کی تعبیر بتانے کا ملکہ یوسف کو ودیعت ہوا ہے..... وہی تیرے دکھوں
کی دوا ہے.....

حضرت یوسف کو زندان سے نکال کر دربار میں لایا گیا۔ بادشاہ نے اُن سے
مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور مجھے اس کی تعبیر چاہیے۔
حضرت یوسف نے پوچھا کہ ”خواب کیا تھا؟“ بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب
میں سات خشک چشموں کو دیکھا جو پانی سے بھرے ہوئے سات چشموں کو ایک سانس
میں پی گئے۔

سات کچی بالیاں دیکھیں جو دانوں سے بھری ہوئی سات پکے خوشوں کو نکل
گئیں۔ سات دبی گائیں دیکھیں جو سات مست (فرہ) ساڈنیوں کو نکل گئیں۔
اس خواب کی مجھے تعبیر چاہیے۔

یوسف نے کہا..... ”تھو پڑے گا۔“

راوی کہتا ہے کہ جو نبی حضرت یوسف کے منہ سے خواب کی تعبیر بیان ہوئی -
بادشاہ نے شدید بھوک محسوس کی۔ حکم دیا کہ فوراً کھانا لایا جائے۔ حالانکہ یہ بادشاہ

کے کھانے کا وقت نہ تھا لیکن خواب کی تعبیر کے اثر سے بادشاہ مغلوب تھا۔ کھانا جو کچھ منگوایا تھا ایک سانس میں ختم کر بیٹھا، اور حکم دیا کہ اور لاؤ..... دیکھیں خالی ہوتی چلی گئیں اور کھانا کھاتے ہی بادشاہ کی موت واقع ہوئی۔

دوسرے روز وزیروں نے مُنادی کی کہ کل تمام لوگ عید گاہ (میدان) میں جمع ہو جائیں جس شخص کے سامنے ہاتھی جھک جائے اور جس کے انگوٹھے پر باز آکر بیٹھ جائے وہی بادشاہ کہلائے گا۔

راوی کہتا ہے: کہ سب لوگوں کے ساتھ حضرت یوسف بھی عید گاہ پہنچے جہاں ہاتھی نے انہیں سجدہ کیا اور باز اُڑتے اُڑتے اُن کے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا۔
اب حضرت یوسف بادشاہ بن گئے۔

اب حضرت یوسف نے اپنی شان دکھائی اور سواری کے لئے ایک ہاتھی منگوا لیا۔ یوسف بادشاہ کہلایا.....

..... داستان سُن لے۔

اے دہاب (شاعر) حضرت یوسف کے گُن گانا جا اور لا اِلهَ الا اللہ کا ورد کرتا جا۔

(کورس) یوسف زلیخا کی داستان سُن لے۔

”پانتہ چوکھ کی بیٹیاں“

”پانتہ چوکھ“ کے گاؤں سے ہر ایک کشمیری باشندہ تو واقف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کہادت سبھی کشمیری جانتے ہیں کہ۔ ”پانتہ چوکھ، نوش سوکھ کو رین ددھ“۔ اس کہادت کے معنی یہ ہیں کہ پانتہ چوکھ کے گاؤں کی بہو دکھیا ہوتی ہے اور بیٹی سکھ اٹھاتی ہے۔ ”پانتہ چوکھ“ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کہادت یا بددعا اُن کے ہمسایہ گاؤں سے اُن کی پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمسایہ گاؤں کی ایک بیٹی ”پانتہ چوکھ“ میں بیاہی گئی تھی۔ ایک دفعہ کسی بات پر دونوں گاؤں میں ٹھن گئی اور دوسرے گاؤں کے لوگوں نے اپنی بیٹی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ”پانتہ چوکھ“ کے ”دکھوالے مجذوب“ کی بے حرمتی کرے۔ تب اس مجذوب نے یہ بددعا دی کہ اس گاؤں کی لڑکیاں سکھی رہیں گی اور بہوئیں ہمیشہ دکھ اٹھائیں گی۔ اس بددعا کے اثر سے بچنے کے لئے لوگوں نے یہ تدبیر بھی کر دیکھی کہ بیٹی کا رشتہ گاؤں سے باہر نہ کیا جائے۔ لیکن یہ اثر پھر بھی قائم رہا، اور گاؤں کی ہر بیٹی میکے میں ہی خوشی محسوس کرتی ہے۔ دوسرے گاؤں کے لوگ اس کہانی کو یوں بیان کرتے ہیں کہ

پرانے زمانے میں ایک مجذوب پانستہ چھوٹے گاؤں میں رہا کرتے تھے جو روحانی طور پر اس گاؤں کے مالک یا رکھوالے تھے۔ اس مجذوب ہستی کو تن بدن کا کوئی ہوش نہ تھا اور کسی بھی شخص کو ان کے نزدیک جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، جو کوئی بھی ان کے قریب جانے کی کوشش کرتا دو چار کالیاں یا پتھر کھا کر واپس لوٹتا۔ لیکن پھر بھی حاجت مند لوگ ملنگ بابا کے قریب جانے کی کوشش ضرور کرتے کیوں کہ انہیں ملنگ بابا کی گالی یا پتھر کھا کر اپنے دل کی مرادیں پوری ہونے کا پختہ یقین تھا۔ اس یقین کا عملی ثبوت گاؤں کا وہ اکلوتا نوجوان تھا جس کے ماں باپ اپنے پیچھے پانچ چھ سال کی ایک بچی کو چھوڑ کر مر گئے تھے۔ ایک دن یہ افسردہ نوجوان اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لے کر مجذوب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجذوب نے اُسے دیکھتے ہی پہلے کالیوں اور پھر پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔ نوجوان آدمی پتھر کھا کر بھانکا اور گھبراہٹ میں اپنی چھوٹی بہن کو وہیں چھوڑ گیا۔ معصوم بچی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ مجذوب نے بڑے پیار سے بچی کا ہاتھ تھام کر اُس سے مزے مزے کی باتیں شروع کر دیں۔۔۔۔۔ نوجوان پلٹ کر آیا تو مجذوب نے پھر اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے سے دُور رکھا۔ ادنیٰ بچی سے تو تلی زبان میں باتیں کرنے لگے۔۔۔۔۔ بس پھر کیا تھا، سارے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی اور لوگ اس یتیم بچی کو کوئی آسانی مخلوق سمجھنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان کے دکھ دلد رہی دُور ہو گئے اور ہمسایہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے نے اُسے رشتے کی پیش کش کی۔ ادھر یتیم بچی "ملنگ کی بیٹی" کے نام سے مشہور ہو گئی اور گاؤں والے "ملنگ بابا کے لئے ضرورت کی ہر چیز اسی بچی کے ہاتھ بھیجتے، جسے ملنگ بابا قبول کر لیتا۔ گاؤں کی بے اولاد عورتیں خاص طور پر اسی یتیم بچی کا سہارا لے کر باباجی سے اولاد کی طالب ہوتیں اور جس عورت پر جتنے زیادہ پتھر یا کالیاں برستیں، اتنا ہی اُسے اپنی دلی مراد برآنے کا پختہ یقین ہو جاتا۔ کتنی ہی بانجھ

عورتیں تھیں جنہیں باباجی کی دُعا سے اولاد کی دولت مل گئی۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ ملنگ کی بیٹی کا بھائی شادی کے برسوں بعد بھی اولاد سے محروم تھا۔ گاؤں کی عورتوں کا خیال تھا کہ اس کی بیوی یتیم نند سے اچھا سلوک نہیں کرتی اور یہ بات کسی حد تک سچی بھی تھی۔

ویسے تو بہو بیگم گاؤں کی بھی عورتوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی کیوں کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی بیٹی تھی اور اس کامیاب بھی اُس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا، لیکن یتیم بچی کے ساتھ اس کا سلوک کچھ اس وجہ سے بھی حاکمانہ تھا کہ اُسے بھائی کے لاڈ پیار نے بہت بگاڑ رکھا تھا۔ اور اُس کی اصلاح بہو بیگم کے نزدیک سخت ضروری تھی۔ اُدھر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہو بیگم بھی کچھ پریشان تھی اور گاؤں والوں کی سوالیہ نظریں اُس کے سینے پر تیر بن کر پیوست ہوتی تھیں۔

یتیم بچی کے ساتھ اس کا برتاؤ اب اذیت کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ یتیم بچی کو گھر گرہستی کے ایسے کاموں میں الجھائے رکھتی کہ وہ ملنگ بابا کے پاس نہ جاسکے، اور ملنگ بابا جیسے کہ اس بچی کے بغیر کسی اور کے ہاتھوں کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ ایک دن بہو بیگم نے والی اور چاچا والوں کا ایک بھرا ہوا اتھال یتیم بچی کے سامنے رکھا کہ وہ والی اور چاچا والوں کے دانے الگ الگ چنتی رہے۔ دوسرے دن اُسے کوڑے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کا کام سونپ دیا گیا، اور ملنگ بابا کھانے کا انتظار کرتے کرتے گاؤں والوں کو صلو تیں سناتے رہے۔

گاؤں کی عورتیں اس بات پر متفق تھیں کہ بہو بیگم یتیم بچی پر صرف اس لئے ظلم نہیں کرتی کہ وہ اپنے بھائی کی بہت زیادہ لاڈلی ہے بلکہ اس ظلم کی اصل وجہ اولاد سے محرومی کا وہ احساس ہے جو بہو بیگم کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔

ملنگ باباجی سے یتیم بچی کا تعلق بہو بیگم کی آنکھوں میں کچھ یوں بھی زیادہ کھٹکتا تھا

کہ یہی منگ بابا گاؤں کی اکثر عورتوں کو اولاد کی نعمت سے سرفراز کر چکے تھے
 بہو بیگم کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ وہ گاؤں کی عام عورتوں کی طرح باباجی سے
 اولاد کی بھیک مانگنے چلی جائے اور سر عام کالیاں سنے۔ ادھر باباجی خود بھی یہ بات
 محسوس کر رہے تھے کہ بہو بیگم انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتی اور وہ یتیم بچی کو بھی اُن
 سے دُور رکھنا چاہتی ہے۔ آخر ایک دن باباجی نے گاؤں کے ماحول کو اس عورت
 کے شر اور غرور سے محفوظ رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ انہوں نے یتیم بچی کے ہاتھ بہو بیگم
 کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ بچی کے ہاتھ مٹی کا ایک کوزہ بھجوائے تاکہ باباجی ایک خاص شربت
 بھیج کر گھر بیٹھے اس کے ہاتھ پن کا علاج کر سکیں۔

یہ پیغام سن کر بہو بیگم کی اتنا کچھ تسکین پہنچی اور وہ رات کے اندھیرے میں
 بھاگی بھاگی خود باباجی کے پاس حاضر ہوئی۔ اب نہ جانے باباجی نے انہیں وہ خاص
 شربت پلایا یا انہیں لیکن صبح کو یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ بہو بیگم کو چپ
 لگ گئی ہے۔ تمام حکیموں اور ویدوں کا خیال تھا کہ اس صحت مند عورت کے گونگے پن
 کا سبب کوئی اچانک صدمہ ہی ہو سکتا ہے لیکن گاؤں والوں کو یقین تھا کہ یہ سب
 کچھ یتیم بچی پر ظلم کرنے اور باباجی کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اُس دن سے لے کر
 آج تک اس گاؤں کی کسی بہو کو کبھی بھی سچی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔

اُبر بادشاہ

بزرگوں نے کہا ہے کہ شیطان جہیم نے بیکار انسانوں کے لئے تین کام مقرر کئے ہیں، اور داناؤں نے بھی یہی بات اس طرح کہی ہے کہ بیکار آدمی کا ذہن شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ یہی حال ایک نے مانے میں اُن درباریوں کا تھا جنہوں نے کشمیر کے حکمرانوں کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا بنا رکھا تھا۔ ایسے ہی درباریوں سے تنگ آکر ایک بادشاہ اپنا تخت و تاج چھوڑ کر قندھار دگندھارا چلا گیا اور مرنے وقت اپنے بیٹے کو یہ وصیت کر گیا کہ وہ اپنے وطن جا کر اُن سازشی درباریوں سے انتقام لے لے۔ اس جلا وطن بادشاہ کے بیٹے کا نام اُبر بادشاہ یا بادلوں کا سردار تھا۔ اُبر بادشاہ اپنے باپ کی وفات کے بعد بھیس بدل کر کشمیر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ درباریوں نے پہلے تو وزیر اعظم کو اپنا بادشاہ بنایا اور پھر اُسے ذلیل کر کے ایک ایسے اجنبی کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا جو اُسی روز سویرے سویرے نہ جانے کس دیس سے کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ یہ اجنبی بظاہر تو کوئی جوگی دکھائی دیتا تھا لیکن اس نے حکومت کا نظام اتنی عمدگی سے چلایا کہ غریب لوگ اُسے دعائیں دینے لگے۔ اُس کے قدم کچھ ایسے

مبارک ثابت ہوئے کہ ملک میں کوئی بھی محتاج نہ رہا، اور سب لوگ اطمینان کا سانس لینے لگے۔ اُدھر درباری حاکموں کے لئے یہ امن و امان پریشانی کا باعث بن گیا اور انہوں نے اس اجنبی بادشاہ کا خاتمہ کرنے کے لئے سازشوں کا جال بچھایا۔ یہ درباری حاکم طرح طرح کی سازشیں کرتے رہے۔ لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور عام لوگ اب ان درباری سازشوں کا سرعام مذاق اڑانے لگے۔ تب درباری سازشیوں نے مشورہ کر کے اندھیرے دیس کے جادوگروں سے امداد کی درخواست کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک تو اندھیرے دیس تک پہنچنے کے لئے ہمالیہ کے برفیلے پہاڑ کو عبور کرنا تھا اور دوسرے یہ کہ اندھیرے دیس کے جادوگر کسی دشمنی کے بغیر خواہ مخواہ کسی بے گناہ آدمی پر اپنا جادو نہیں چلا سکتے تھے۔ کیوں کہ جادوگر مگر کے ان لوگوں کو ہر سال ایک خاص تہوار کے موقع پر اس وعدے کو دہرانا پڑتا تھا کہ وہ بے گناہ لوگوں پر جادو کے تیر نہیں چلا دیں گے.....

بہت سوچ بچار کے بعد درباری سازشیوں نے یہ چال چلی کہ اجنبی بادشاہ کے ہاتھوں کسی طرح سے کشمیر کی اُس دیران عبادت گاہ کی بے حرمتی کر دائی جائے، جو جادوگروں سے منسوب تھی۔ ان لوگوں نے بھولے بادشاہ سے یہی حرکت کروائی اور اندھیرے دیس سے جہاں سورج کی روشنی کبھی زمین تک نہیں پہنچتی، ایک جادوگر نے بادشاہ سے انتقام لینے کی غرض سے کشمیر کا رخ کیا اور شاہی محل کے قریب تاک میں بیٹھی مناسب موقع ڈھونڈتی رہی۔

اتفاق سے بادشاہ سویرے سویرے عبادت کے لئے گھر سے نکلا، تو سامنے ایک نحیف عورت کو ہاتھ پھیلائے ہوئے دیکھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ جادوگر نے بولی کہ وہ بھوک سے بڑھال ہے اور اُسے اپنا من بھاتا کھا جائے۔ نہیں۔ بادشاہ نے اُس کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا تو جادوگر نے مطالبہ کیا کہ اُسے

تازہ گوشت فراہم کیا جائے۔ بادشاہ اس مطالبے سے پریشان ہوا۔ کیونکہ اس کے مذہب اور قانون کے مطابق کسی جانور کو مارنا جرم تھا اور جادوگر نے اپنے مطالبے کو دہراتے ہوئے نہایت طنز سے کہا کہ اے بادشاہ میں تیری دریا دلی اور رحم کے قصے سن کر دودیس سے چلی آئی تھی، اگر تو کسی جاندار کا گوشت فراہم نہیں کر سکتا، تو مجھے اپنے جسم کا گوشت ہی کھلا دے۔ بہتر یہ ہو گا کہ تو مجھے اپنے بازوؤں کی ہڈیاں کھلا دے کیونکہ تیرے ہاتھوں سے ہماری ایک پرانی عبادت گاہ کی بے حرمتی ہوئی ہے۔ اب بادشاہ اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچا، اور اس نے اپنے گناہ کی معافی چاہی۔

بادشاہ پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس جادوگر نے اس کا تعلق جس ملک سے ہے وہاں کے لوگ جادو پر تو اب بھی یقین رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اس نئے مذہب کو بھی اختیار کیا ہے جس میں کسی جاندار کا خون بہانا منع ہے۔ وہ اسی شش درپنچ میں مبتلا تھا کہ جادوگر نے بولی۔ ”اے بادشاہ! تو اس ملک کے سازشی درباریوں سے علیا کو محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تو میرے ساتھ میرے ملک میں آ جا۔“

بادشاہ نے کہا کہ میں اس ملک کے لوگوں کو سازشی درباریوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کیسے جاسکوں گا؟۔ جادوگر نے بولی کہ جو میں جادو کے علم سے جانتی ہوں وہ تو نہیں جانتا۔ پس سن لے کہ ان ظالموں کے دن گنے جا چکے ہیں۔ جس بادشاہ کو ان لوگوں نے جلا وطن کیا تھا اس کا بیٹا اس شہر میں موجود ہے جو ان تمام ظالموں کا خاتمہ کر دے گا۔ تب بادشاہ نے دوسرے ہی روز یہ اعلان کیا کہ وہ راج پاٹ چھوڑ کر جا رہا ہے، اور جانے سے پہلے تمام شہریوں سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ اعلان سننے ہی تمام لوگ شاہی محل کی طرف چل پڑے۔ درباری خوش تھے کہ انہیں اس بادشاہ سے بیٹھے بٹھائے نجات ملی ہے اور اب وہ اپنی پسند کے کسی اور کٹھ پتلی کو تخت پر بٹھا دیں گے لیکن ان کی امیدیں اس وقت خاک میں مل گئیں جب جادوگر نے جلا وطن بادشاہ کے

بیٹے کو پنڈال پر جا کر لاکھڑا کیا، اور کہا کہ
 ”اے لوگو! یہ تمہارے اُس بادشاہ کا بیٹا ہے جسے سازشی درباریوں نے
 جلا وطن کر دیا تھا، اور اب اس شہزادے کی تلوار اُن تمام سازشی درباریوں کو
 ٹھکانے لگا دے گی۔ جو آج تک بادشاہ اور رعایا کے درمیان دیوار بنے ہوئے۔“
 یہ اعلان سننے ہی لوگ ظالم درباریوں پر پل پڑے۔ اور اُن کا خاتمہ کرنے
 کے بعد جلا وطن شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس شہزادے کے عدل و
 انصاف کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُسے ابر بادشاہ یا میگھ راج کے نام سے
 یاد کرتے ہیں۔

سوداگر کی کہانی

ایک سوداگر کسی دوسرے شہر کو مال خریدنے کے لئے چلا گیا۔ اس کے گھر میں جو بیوی تھی، وہ ایک بھکاری کو دل دے بیٹھی۔ کچھ مدت گزری۔ ایک دن سوداگر مال لے کر اپنے گھر لوٹ آیا۔ بادشاہ تک بھی یہ بات پہنچی کہ فلاں سوداگر دوسرے شہر سے مال لے کر واپس آگیا ہے۔ رات کو بادشاہ بھیس بدل کر شہر کی سیر کو نکلا۔ رات کا پہلا پہر گزرنے پر بادشاہ اُس سوداگر کے گھر کے قریب پہنچا اور اُس کے مکان کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اچانک بادشاہ نے یہ منظر دیکھا کہ سوداگر کی بیوی چُپ چاپ کھانے کا ایک تھال سر پر رکھ کر گھر سے باہر نکلی۔ آگے آگے سوداگر کی بیوی اور پیچھے پیچھے بادشاہ دبے پاؤں چلتے گئے۔

سوداگر کی بیوی شہر سے باہر ایک میدان میں پہنچی جہاں گداگر دُاس کا مَاشق، بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ سوداگر کی بیوی نے اُسے سلام کیا۔ چادلوں کی تھالی اُس کے آگے رکھ دی اور کھانا کھانے کو کہا۔

گداگر نے غصے میں اس عورت پر لاشٹھی کا ایک وار کیا، اور لکھارا کہ تو اتنی

دیر گئے کیوں آئی؟ وہ کہنے لگی کہ آج میرا خاوند سفر سے واپس آ گیا ہے اس لئے
دیر ہو گئی۔ اب اُٹھ کر کھانا کھا لو۔

گداگر بولا کہ یوں میں کھانا نہیں کھاؤں گا، پہلے اپنے میاں کا سر کاٹ کر
میرے قدموں میں رکھ دو۔ بادشاہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اُن دونوں کی
گفتگو سن رہا تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ سوداگر کی بیوی اٹھی، گھر کا رخ کیا، اور
وہ پاؤں گھر میں داخل ہو گئی۔ بادشاہ اس کا تعاقب کر کے یہ تمام ماجرا دیکھنا
رہا۔

جوں ہی سوداگر کی بیوی گداگر کے پاس پہنچ گئی گداگر نے اس کے خاوند کا کٹ
ہوا سر دیکھ کر اپنی پوری قوت اور نفرت سے سوداگر کی بیوی کے سر پر لاٹھی مار دی۔
گداگر بولا۔ ”تو جو اپنے خاوند کی وفادار نہیں تو مجھ سے بھلا کیا وفا کرے گی؟“
یہ ماجرا دیکھ کر بادشاہ نے ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لی اور
سو گیا۔

صبح ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کہ سوداگر کو جو کل ہی اپنے گھر واپس آیا
تھا۔ چوڑوں نے مار ڈالا۔ سوداگر کی بیوی بھی بادشاہ کے پاس پہنچ کر فریاد کرنے
لگی کہ رات کو چوڑوں نے میرے میاں کو قتل کر ڈالا۔

اب بادشاہ کو تو سب معلوم ہے کہ سوداگر کا قاتل کون ہے۔ متعلقہ لوگ
قاتل کا سراغ لگا رہے ہیں لیکن کچھ معلوم نہیں ہو پاتا۔ کہ قاتل کون ہے؟
استاد بیان کرتا ہے کہ آفر لوگوں نے اس سوداگر کی نعش کو اُٹھا کر جلائے کے
لئے شمشان بھومی تک پہنچا دیا۔ بادشاہ بھی یہ تماشا دیکھنے کو ادھر کی جانب روانہ
ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ

سوداگر کی بیوی شمشان بھومی کے گرد چکر لگا رہی ہے اور اپنے میاں کی چٹا

میں جلنے کے لئے بے چین ہے۔ وہ چتا میں چھلانگ لگانے کو دڑی تو بادشاہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”وہ سب کیا تھا اور یہ سب کیا ہے؟“ یعنی وہ رات والی بات کیا تھی اور یہ کیا بات ہے کہ میاں کو قتل کر کے اب اُس کی چتا میں جل رہی ہو؟ سوداگر کی بیوی نے کہا کہ پہلے مجھے چتا میں جل جانے دو۔ باقی رہا تمہارا یہ سوال، سو اس کا جواب تمہیں میری ایک بہن سے ملے گا۔ جو فلاں چشمے پر رہتی ہے اور اُس چشمے کی دیوی ہے۔

بادشاہ نے سوداگر کی بیوی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ چتا میں جل مری۔

کل بادشاہ اُس چشمے کی طرف روانہ ہو گیا اور چشمے پر ایک عورت کو دیکھا۔ بادشاہ نے اُس سے وہی سوال کیا کہ اگر وہ بات تھی تو یہ کیا بات ہوئی؟ اُس عورت نے بادشاہ سے کہا کہ آٹھ دن بعد تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔ آٹھ دن گزر گئے اور بادشاہ اُس چشمے کی طرف بھاگا۔ اُس عورت سے پوچھا کہ اس بات کا مطلب بتا دو؟ عورت کہنے لگی کہ جا کر ایک گھڑا اور ایک بکرے آؤ، بادشاہ گھڑا اور بکرے آیا۔ اُس عورت نے چشمے میں گھڑے کو اٹھا کر اُس پر بکرے کی گمہ دن رکھ دی اور بادشاہ سے کہا کہ ”تلوار کا وار کرو۔ بکرے کی گردن پر تلوار کا وار کرتے ہی بادشاہ اُس جگہ سے غائب ہو گیا۔ بالکل غائب۔

استاد کہتا ہے کہ بادشاہ کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک باغ میں پایا۔ بادشاہ نے ایک پتنگ بچھا ہوا دیکھا اور اُس پر لیٹ کر آرام کیا۔ اب پر پر کا ایک غول آیا اور بادشاہ کو اٹھا کر ایک ایسی جگہ پہنچا دیا گیا جہاں بادشاہ نے محسوس کیا کہ وہ جنت میں ہے۔ اب نعمہ و سرور کا دور شروع ہوا، اور بادشاہ رقص و سرور کی اس محفل میں کھو گیا۔ پرریاں رخصت ہو گئیں اور جاتے ہوئے

بادشاہ کے ہاتھ میں ایک چابی تھما دی اور اُسے ایک کمرے کے دروازہ کا تالا کھولنے کو کہا۔ بادشاہ نے اندر داخل ہو کر ایک سجے سجائے گھوڑے کو دیکھا اور اُس کی لگام تھام کر اُسے باہر لے آیا۔ پر یوں نے کہا کہ اس گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ بادشاہ نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی ایک نظر میں وہ سب کچھ دیکھ لیا جو خدا نے سات زمینوں کے اُد پر اور نو آسمانوں کے نیچے پیدا کیا ہے، اور اُسی میں محو ہو گیا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ شیطان نے بادشاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ ”جو کچھ اللہ میاں نے پیدا کیا ہے سو دیکھ رہا ہوں“ بادشاہ بولا۔ شیطان نے کہا کہ ”اس سے زیادہ تو میں تمہیں دکھلا سکتا ہوں جو میری چابی لے کر اُس کمرے کا دروازہ کھولو، اور اندر داخل ہو جاؤ۔“ بادشاہ اندر داخل ہوا، تو دیکھا کہ ایک گدھا تنھان پر بندھا ہوا ہے۔ شیطان نے حکم دیا کہ اس گدھے پر سوار ہو جاؤ جو کچھ اللہ میاں نے پیدا کیا ہے اُس سے بھی سوا دیکھو گے۔“

بادشاہ گدھے پر سوار ہو گیا۔ اُسناد کہتا ہے کہ گدھے نے بادشاہ کو سیدھے اپنے گھر پہنچا دیا۔ بادشاہ گدھے کی پیٹھ سے نیچے اُتر کر اپنے محل میں داخل ہوا۔ اب جو مڑ کر سمجھے دیکھا تو گدھا غائب۔ بادشاہ اُس باغِ جنت کی یاد میں تڑپ رہا تھا، لیکن اب دوبارہ وہاں کیسے پہنچے۔

اُسناد کہتا ہے کہ بادشاہ پھر اسی چشمے پر پہنچا اور اُس عورت سے پھر وہی سوال پوچھا کہ ”اگر ایسا ہے تو ویسا کیوں ہے؟“ عورت بولی کہ ایک گھڑالاؤ اپنے بیٹے کو بھی لے آؤ، ایک تلوار بھی ساتھ لیتے آنا۔ بادشاہ نے حکم کی تعمیل کی تو وہ عورت کہنے لگی۔ ”اس چشمے میں اُتر جاؤ۔“ اپنے بیٹے کو بھی چشمے میں اُتار دو اور گھڑے پر اُس کی گردن رکھ کر اُسے لٹا دو۔

بادشاہ نے اپنے بیٹے کو کان سے پکڑا، اور تلوار لہرا کر اس کی گردن پر وار کر
 رہا تھا کہ عورت نے بادشاہ کا بازو پکڑ کر کہا — ”ٹھہر جاؤ — اب تو یہ بات
 تمہاری سمجھ میں آگئی نا؟ — ”یہ دہی بات ہے اور وہ بھی ایسی ہی بات تھی“ یعنی
 تم باغ پر عاشق ہو گئے اور بیٹے پر وار کرنے لگے میری بہن بھی اُس گداگر پر
 عاشق تھی اور اُس نے اپنے خاوند پر وار کیا۔

ہمیشہ مال اور ناگ رائے

پُرانے زمانے میں اننت ناگ (اسلام آباد) میں ایک غریب برہمن رہا کرتا تھا۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب وہاں اننت ناگ کی پوجا کی جاتی تھی۔ غریب برہمن کی اپنی غربت ہی کیا کم تھی کہ اس پر اُس کی بد زبان بیوی نے بھی اُس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ایک دن بد مزاج بیوی نے پریشان حال برہمن کے ہاتھ میں یہ کہہ کر ایک تھیلہ تھما دیا کہ آج گھر میں ایک دانہ بھی اناج کا نہیں ہے اور جب تک چوری کر کے یا بھیک مانگ کر ہی سہی، کچھ کھانے کے لئے نہ لاؤ، اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔ برہمن تھیلہ لے کر گھر سے تو چل دیا لیکن اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر وہ کھانے کے لئے اناج کہاں سے لائے؟ اُس کا سرچ کرنے لگا اور وہ اننت ناگ کی ایک ریش پر تھیلہ سرمانے رکھ کر سو گیا۔ کچھ دیر بعد برہمن کی آنکھ کھلی تو اُسے تھیلے میں کسی چیز کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دیکھا تو تھیلے میں ایک سانپ گھسا بیٹھا ہے۔ برہمن نے فوراً تھیلے میں گرہ لگاٹی اور یہ سوچتے ہوئے تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوا کہ غربت افلاس کو برداشت کرتے ہوئے تو ادھی سے زیادہ عمر بیت گئی ہے، باقی دن بھی گزر

ہی جائیں گے۔ لیکن بد مزاج بیوی کو برداشت کرنے کی اب مجھ میں ہمت باقی نہیں ہے، کیوں نہ آج یہ تھیلّا اُس کے سپرد کر دوں، جسے کھولتے ہی وہ زہریلے سانپ کا شکار ہو جائے۔ گھر پہنچتے ہی برہمن چلا یا کہ "بیوی دیکھو تو میں تھیلے میں کیا تیز لایا ہوں۔"

برہمن کی بیوی نے تھیلے کا منہ کھولا تو سانپ کو دیکھ کر خوف کے مارے چیخ اٹھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک نیا منظر دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سانپ نے جَوْن بدل کر ایک خوب صورت لڑکے کا رُوپ اختیار کیا اور بولا "پیاسے لوگو! اگر تم دونوں مجھے اپنی اولاد کے طور پر قبول کر لو تو ساری عمر منسی خوشی گزار لو گے۔" بے اولاد عورت نے سچے کو کلے سے لگایا اور برہمن بھی بہت خوش ہوا۔ اس لڑکے کا نام "ناگ رائے" رکھا گیا، جس کے معنی ہیں چشمے کا رکھوالا یا سانپوں کا سردار۔ کیونکہ یہ لڑکا انہیں انت ناگ نامی چشمے پر سانپ کے رُوپ میں حاصل ہوا تھا۔ چند برس یونہی بیتے اور یہ لڑکا اب ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ ایک دن ناگ رائے شاہی محل کی طرف جانکلا، اور سانپ کا رُوپ دھار کر دیوار کے ایک سوراخ سے محل کے اندر داخل ہو گیا۔

محل کے جنوب میں ناگ رائے نے ایک تالاب میں جی بھر کے غسل کیا اور اسی رُوپ میں دیوار کے سوراخ سے باہر نکل کر پھر انسان کا رُوپ دھار لیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

شاہی محل میں غسل کرنے کا یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ جہاں اب وہ سانپ کی جَوْن بدل کر انسانی شکل میں بھی غسل کیا کرتا تھا۔

ایک دن راجکمار کی نظر اس پر پڑی اور اس نے اپنی خادمہ کو اس کی ٹوہ لگانے کے لئے بھیج دیا۔ خادمہ نے راجکمار کو بتایا کہ وہ قصبے کے ایک غریب برہمن اکلوتا

بیٹا ناگ رائے ہے۔

راجکمار نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی کہ وہ صرف اور صرف اسی نوجوان سے شادی کرے گی۔ اس کے باپ نے بہت زور لگایا کہ وہ اس غریب برہمن لڑکے کے ساتھ بیاہ نہ کرے لیکن آخر اسے ہارمانی پڑی۔ اور برہمن کے گھرانہ دونوں کو بیاہنے کے سلسلے میں پیغام بھیجا گیا۔

برہمن پریشان تھا۔ لیکن ناگ رائے نے یہ کہہ کر اس کی پریشانی دور کر دی کہ ابا جان آپ بھوج پتر لے کر اس چشمنے میں ڈال دیں جہاں میں آپ کے تھیلے میں گھس گیا تھا۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ برہمن نے بھوج پتر کو چشمنے میں پھینک دیا اور آنکھیں ملتے ہوئے کیا دیکھتا ہے کہ اس کے سامنے ایک محل کھڑا ہے جس میں شادی کے تمام سامان سجے ہوئے ہیں۔ یوں ناگ رائے اور صیہ مال کی شادی ہوئی۔ اور وہ خوش خوش رہنے لگے۔

ادھر پاتال میں جہاں ناگ رائے کی کئی رانیاں تھیں یہ خبر پہنچ گئی کہ ناگ رائے نے ایک آدم زاد سے شادی کر لی ہے۔ رانیاں یہ سن کر جل بھن گئیں اور ایک رانی نے ناگ رائے کی عیاشیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے پاتال سے نکل کر ایک عورت کا روپ دھار لیا اور چاندی کے برتن سر پر اٹھائے ہوئے صیہ مال کے گھر تک پہنچ کر (لے لو چاندی کے برتن) کی ہانک لگائی ان برتنوں میں چاندی کا وہ پیالہ بھی تھا جس میں ناگ رائے پاتال میں رہ کر دودھ پیتا تھا۔ شام کو ناگ رائے گھر پہنچا تو صیہ مال کے ہاتھوں میں یہ پیالہ دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ناگ رانیوں کی سازش ہے۔ لیکن اس نے صیہ مال کو صرف اتنا کہہ کر بات کو ختم کرنا ضروری سمجھا کہ ”ایسی عورتوں سے کوئی چیز نہ خرید کر دو۔ کچھ دنوں بعد ناگ رائے کی ایک اور ناگ رانی بنجارن کا روپ دھار کر آئی اور صیہ مال سے پوچھا ”کیا میرا شوہر

ناگ رائے اس گھر میں رہتا ہے۔ "مجھے معلوم تھا کہ وہ نیچ ذات کا آدمی کسی برہمن گھرانے کو پیدا کر کے چھوڑے گا۔"

ہیہ مال کو ان باتوں کا یقین نہ آیا تو بنجارن نے کہا کہ اگر تجھے میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو ذرا ناگ رائے سے کہہ دے کہ وہ شہر کے باہر مقدس چشمے کے پانی میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھالے کہ وہ ذات کا برہمن ہے۔

شام کو ہیہ مال نے مشکوک انداز میں کچھ سوال پوچھے تو اس نے ہیہ مال کو یہ کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ ایسی فضول باتیں اپنے دماغ میں نہیں بٹھایا کرتے، لیکن ہیہ مال بھلا کہاں ماننے والی تھی۔ آخر ناگ رائے کو قسم کھانے کے لئے مقدس چشمے پر جانا ہی پڑا۔ جو ہی ناگ رائے چشمے میں اترا، اسے ناگنوں نے نیچے پاتاں کی طرف کھینچا اور ہیہ مال چشمے کے کنارے ناگ رائے کو غائب ہوتے دیکھ کر ہاتھ ملتے اور روتی دھوتی رہ گئی۔

اب اس کا سارا وقت پوجا پاٹ کرنے اور غریبوں کو دان مینے میں گزرتا۔ ایک روز ہیہ مال کے گھر سے کسی جوگی کا گزرا ہوا اور جوگی نے اسے اپنی آنکھوں دیکھا یہ واقعہ سنایا کہ میں ایک ن فلان چشمے سے گزر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خوش پوش خوب صورت راجکمار چشمے سے نکلا اور اپنے ہاتھ میں کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوا ایک تھال لے کر ایک درخت کی طرف بڑھا اس راجکمار نے تھال کو درخت کے نیچے زمین پر رکھا اور کہا کہ "پیارے ہیہ مال یہ کھانا تمہارے نام کا ہے۔"

یہ سنتے ہی ہیہ مال کو یقین ہو گیا کہ چشمے سے کھانے کا تھال لے کر نکلنے والا آدمی ناگ رائے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ چشمے پر گئی اور ناگ رائے کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

آدھی رات کو ناگ رائے چشمے سے برآمد ہوا تو ہیہ مال اسے دیکھتے ہی ہچکار اٹھی۔

”ناگ رائے مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔“ ناگ رائے کو معلوم تھا کہ ناگ رانیاں
 ھیٹل کو جینے نہ دیں گی۔ لیکن ھیٹل ناگ رائے سے جدا ہونے پر تیار نہ تھی۔ آخر
 ناگ رائے نے ھیٹل کو ایک چمکتے ہوئے ہیرے میں بدل دیا۔ اور اپنے ساتھ لے
 کر پاتال چلا گیا۔

ناگ رانیوں کے دلوں میں پہلے ہی شک تھا انہوں نے ناگ رائے سے ملتے
 ہی پہلا سوالی یہی کیا کہ آپ سے انسانی جسم کی بڑکیوں آرمی ہے۔ تب ناگ رائے
 نے ناگ رانیوں کی منت سماجت کی اور وہ اس بات پر راضی ہو گئیں کہ ھیٹل
 اپنے اصل انسانی روپ میں ان کے ساتھ رہے گی۔ ناگ رانیاں ھیٹل کو طرح طرح
 سے ستاتی تھیں۔ ایک دن اُسے سنپوں کے لئے دودھ گرم کرنے کو کہا گیا۔
 اتفاق سے ھیٹل کے ہاتھوں گرم گرم دودھ کے برتن پر چھچھوٹ کر گر گیا۔ اور
 سنپوں نے یہ سمجھا کہ انہیں دودھ پینے کے لئے بلایا گیا ہے۔ وہ بھاگے بھاگے آئے
 اور اُبلتے ہوئے دودھ کی کڑاہی میں گر کر مر گئے۔

اس حادثے سے ناگنوں کے ہوش و حواس جاتے رہے اور انہوں نے ٹوٹ کر
 ھیٹل مال پر ایسا حملہ کیا کہ وہ اُن کے ڈسنے سے موت کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ ناگ رائے
 نے اپنی محبوبہ کو مردہ حالت میں پایا تو اس کی لاش اٹھا کر پاتال سے باہر لے آیا۔ لاش
 کو ایک چنار کے نیچے چھوڑ کر ناگ رائے واپس پاتال چلا گیا۔ اتنے میں وہاں سے کسی
 جوگی کا گزر ہوا تو اُس نے چنار کے نیچے ایک خوب صورت عورت کی لاش کو پڑا پایا۔
 جوگی نے کچھ جڑی بوٹیاں تلاش کر لیں اور ھیٹل مال کو اٹھا کر اپنی کٹیا میں لے آیا۔
 ادھر ناگ رائے پاتال سے واپس آیا تو لاش کو غائب پایا۔ کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ
 ھیٹل مال جوگی کی کٹیا میں ہے۔ ناگ رائے سانپ کا روپ دھار کر کٹیا میں داخل ہوا
 تو دیکھا ھیٹل مال گہری نیند سو رہی ہے۔

ناگ رائے کنڈلی مار کر اُس کے سر ہانے بیٹھا رہا۔ اتفاق سے جوگی کا ایک چیلاندر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ھھیہ مال کے سر ہانے ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اُس نے ایک ہی وار سے سانپ کو مار ڈالا۔ شور سن کر ھھیہ مال جاگی تو دیکھا کہ اس کا محبوب مرا پڑا ہے۔ خیر سانپ کو چتا میں جلا یا گیا۔ اور ھھیہ مال نے بھی اسی آگ میں کود کر جان دے دی۔

جوگی کو اس حادثے سے بڑا دکھ پہنچا کہ مصیبت کی ماری ایک عورت کا جوگی کی تحویل میں ہونے کے باوجود اتنا بُرا انجام ہو، غمگین جوگی آنکھیں بند کئے یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ ”اے جوگی ان دونوں کی راکھ کو چشمے میں پھینک دے۔“ جوگی نے اس غیبی آواز پر عمل کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ھھیہ مال اور ناگ رائے انسانی روپ میں چشمے سے باہر نکل آئے اور اس کے بعد برسوں تک ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔

لالہ ملک کا گیت

میرے مالک۔ میری گریہ و ناری، میری فریاد سُن لے اور مجھے بچالے کہ یہ
دنیا تو ایک بازی گر کی طرح فریب دیتی ہے۔
پہلے حضرت آدم کو بنایا گیا۔ فرشتوں نے آدم کی تعمیر میں حصہ لیا، پھر
ابلیس نے آدم کو ایسا بہکایا کہ بدنام ہو کر رہ گیا۔

یہ دنیا تو دھوکہ ہے۔

حضرت نوح سے جو آدم کی اولاد تھے کس طرح لوگوں نے منہ پھیر لیا۔ پھر
حضرت نوح کی آہ نے وہ طوفان برپا کر دیا کہ وہ ساری دنیا کو لے ڈوبا۔

یہ دنیا تو بازی گر کا تماشہ ہے

حضرت موسیٰ نے ایک قدم بڑھ کر مولیٰ کا دیدار کیا اور کوہ طور پر باتیں کیں

یہ دنیا ایک بازی گچہ ہے۔

حضرت ابراہیم کیا کم تھے جنہوں نے بتوں کی پوجا سے منہ موڑا، انہی نے تو دینِ محمدیؐ

کو مستحکم کیا۔

میرے مرنے پر مجھے اپنے ہی بھائی اور دوست قبر میں اتاریں گے۔ وہاں
مجھے اس کے سوا اور کیا دکھلائیں گے کہ یہ دنیا ایک دھوکہ ہے۔

طوطا کہانی

اُستاد کہتا ہے کہ ایک شہر بھستا، وہاں ایک بادشاہ تھا، جس کا نام
 بھتا بہادر خان۔ اُس بادشاہ نے اپنی بیگمات کے لئے ایک باغ بنوایا تھا۔ اُس
 باغ میں کسی نامحرم کو جانے کی اجازت نہیں تھی اور اُسی باغ میں اچانک کہیں سے
 ایک فقیر دکھائی دیا۔ نظر بازوں نے نگاہ کی اور ”خبرداروں“ نے آگاہی کی۔ بادشاہ
 کو آگاہ کیا گیا کہ ایک فقیر بیگمات کے باغ میں گھس آیا ہے۔ بادشاہ نے سنا تو
 دیر کر اپنے ساتھ لے کر باغ میں پہنچا اور وہاں ایک فقیر کو موجود پایا۔ دقلم،
 — ”وہ (خدا) جس کے لاکھوں نام ہیں ہر جگہ اور ہر شے کو دیکھتا ہے

سُن لے اے انسان۔ اس دُنیا میں وفا کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

بادشاہ نے کہا، ۱۰ اے درویش! تو کون ہے، یہاں کیوں اور کہاں سے آگیا؟
 فقیر نے کہا کہ میں نے سیر کی۔ تمہارا کیا بگاڑا؟ سُن لے اے انسان —
وفاداری کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔

بادشاہ کے سامنے پھولوں سے لدے پھندے ایک درخت کے نیچے ایک

بیل مردہ حالت میں پڑی ہوئی ہے، فقیر پر کپکپی سی طاری ہوگئی اور نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ فقیر کے گرتے ہی بیل کے مردہ جسم میں جان آگئی اور وہ ہوا میں اڑنے لگی۔ دو ایک پھر کاٹ کر بیل مردہ حالت میں پھر زمین پر آگری۔ اور بادشاہ کو یہ تماشا دکھا کر فقیر دوبارہ زندہ ہو گیا۔ فقیر اٹھ کر جانے لگا۔ اب بادشاہ اور وزیر اس کے پاؤں پڑ رہے ہیں۔

کہنے لگے : (نظم)

”اے درویش! ہم تیری خدمت کریں گے۔ اے فقیر، ہم دودھ کی بالائی کے پیالے تجھے پیش کریں گے۔ ہم تیرے لئے خاص پلاؤ پکائیں گے۔ سن اے انسان کہ دنیا میں دنا کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے“ جو ”ذلیف“ فقیر کے پاس تھا اُس راز سے اُس نے بادشاہ کو آگاہ کیا اور بادشاہ نے وہی بھیدا اپنے لالچی وزیر کو بھی بتا دیا۔ (نظم)

”بادشاہ نے وزیر کی تربیت کی اور اُسے بھی راز سے واقف کر دیا۔ پھر وہ دونوں شکار کرنے چلے گئے۔ سن لے کہ دنا داری عنقا ہے۔ انھوں نے بیابان میں ایک طوطے کو مردہ حالت میں پایا۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا اے وزیر یہ طوطا زندہ حالت میں کتنا خوبصورت ہوگا؟ میرا جی چاہتا ہے کہ اسے تھوڑی دیر زندہ حالت میں دیکھوں۔ پس اے وزیر تو اپنی روح اس مردہ طوطے میں داخل کر لے۔ سن لے کہ دنا داری عنقا ہے۔

وزیر نے کہا: ”بادشاہ سلامت۔ یہ طوطا تو نہ جانے کب سے مردہ حالت میں ہے۔ اس کے جسم کی بدبو تو ناقابل برداشت ہے۔ میں تو اس کے پاس ٹھہر بھی نہیں سکتا۔ پھر میں اپنی روح اس میں کیسے داخل کر سکوں گا؟

سن لے کہ دنا داری معدوم ہے“

بادشاہ نے وزیر کی مہمت سنا بہت کی کہ میں ایک نظر دیکھ لوں، زندہ حالت میں یہ طوطا کس قدر خوب صورت ہوگا۔ لیکن وزیر نے ایک نہ سنی۔ کیونکہ اُس کا دل فریب اور دغا سے بھرا ہوا تھا۔

اب بادشاہ خود اس مُردہ طوطے کے جسم میں داخل ہو گیا اور اپنے جسم کو رُوح سے خالی کر گیا۔ طوطا زندہ ہو کر فضا میں اُڑ رہا ہے۔ وزیر نے فوراً اپنی رُوح کو بادشاہ کے مُردہ جسم میں داخل کر دیا کیونکہ یہی اس کی خواہش تھی۔ (نظم)

بادشاہ نے خود غلطی کی اور اب وزیر کو تصور وار قرار دے رہا ہے حالانکہ وزیر تو کب سے اس موقع کی تلاش میں تھا.....

”سُن لے کہ وفاداری کا کہیں بھی وجود نہیں ہے“

طوطا آسمان کی سیر کر رہا ہے اور وزیر بادشاہ کے مُردہ جسم میں داخل ہو کر بادشاہ کے رُوح میں زندہ ہو گیا ہے۔

نقلی وزیر بادشاہ کے رُوح میں لوگوں کے سامنے شاہی گھوڑے پر سوار ہو کر پہنچا اور کہنے لگا کہ اے لوگو! میرا وزیر گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا ہے یہ تیر لوگوں میں ہر جگہ پھیل گئی۔

”سُن لے کہ وفاداری عنقا ہے۔“

بادشاہ کے مُردہ جسم میں داخل ہو کر وزیر نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے مُردہ جسم کو شمیر سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نئے بادشاہ (وزیر) نے فوج کو حکم دیا کہ تمام تیر انداز اور بندوچی جا کر طوطے کو ہلاک کر دیں۔ جو آدمی طوطے کو مار ڈالے گا۔ اُس پر انعام و اکرام کی بارش ہوگی۔

تیر انداز کو حکم دیا کہ میری باتوں پر کان دھرو، میں حکم دیتا ہوں کہ طوطے کو ہر حالت

میں ہلاک کیا جانا چاہیے۔

سُن لے کہ دفا داری عنقا ہے۔

طوطے نے جونہی یہ حالت دیکھی وہ بھاگ گیا۔ طوطا اسی بادشاہ کے پاس پہنچ گیا جو اُس دن بیگمات کے باغ میں ظاہر ہوا تھا۔ جو اصل بادشاہ ہے وہ تو فقیر کے پاس ہے۔ اور اُس کو کسی نے بھی ہلاک نہیں کیا۔

ایک روز یہ نیا بادشاہ میر کو نکلا، اور ایک جگہ پہنچ کر اُس نے سونے کی طرح چمکتے ہوئے ایک ہرن کو دیکھا، بادشاہ اور شکر اُس ہرن کے تعاقب میں بھاگے اور اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بادشاہ نے سب کو انتباہ کیا کہ جس شخص کی جانب سے ہو کر ہرن بھاگ نکلا اُس آدمی کو اپنی جان کی قیمت دینی پڑے گی۔

اُستاد کہتا ہے کہ اُس ہرن نے سیدھے بادشاہ کی طرف جت لگائی اور بادشاہ کے سر سے گزرتے ہوئے ایک ہی چھلانگ میں گھیرے کو توڑ کر بھاگ نکلا۔ اب جو وہ طوطا یعنی اصلی بادشاہ تھا، اُسے صاحبِ حالی فقیر نے ہدایت کی کہ تو آج یہاں سے چلا جا۔ آج تو اپنی مراد پا لے گا۔ اُدھر نقلی بادشاہ اور اُس کا لشکر ہرن کے تعاقب میں مصروف ہے لیکن ہرن اُن سے بہت دُور آگے بھاگتا چلا گیا۔

داستان گو کہتا ہے کہ لشکر کی راہ میں ایک مُردہ ریکھ پڑا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اپنی روح کو اس ریکھ کے مُردہ جسم میں داخل کر دیا اور ریکھ کے قالب میں ہرن کے پیچھے دوڑا، اور اپنے جسم کو (جو اصل میں پہلے بادشاہ کا جسم تھا) راستے ہی میں چھوڑ دیا۔ یہ خبر سنتے ہی طوطا دوڑا، اور ایک درخت کے تنے میں چھپ کر انتظار کرتا رہا۔ اُس نے (یعنی بادشاہ نے) اپنے مُردہ جسم کو دوبارہ پایا۔ مبارک ہو: سُن لو کہ دفا داری اس دنیا میں ناپید ہے۔

طوطا نیچے گر گیا اور روح اپنے (بادشاہ کے) قالب میں دوبارہ داخل ہو گئی۔
 باقی رہی وزیر کی بات، اُس کی روح تو ریچھ کے قالب میں ہرن کا تعاقب کر رہی تھی
 اب اصلی بادشاہ نے شاہی گھوڑے پر سوار ہو کر لوگوں سے کہا کہ ”ریچھ کو مار ڈالو“
 بند و قبیضیوں نے ریچھ کی ٹانگ پر گولی مار دی اور اُسے زخمی حالت میں بادشاہ کے
 پاس لے آئے۔ بادشاہ نے کہا کہ تم نے میرے ساتھ غداری کی ہے۔ میں شاید
 تمہیں ہلاک نہ کرنا لیکن لوگ مجھے طعنے دیں گے کہ بادشاہ نے ایک ریچھ کو اپنا
 وزیر بنایا ہے۔ تو نے اپنے مُردہ جسم کے خود ہی ٹکڑے کر دیئے ہیں اور ظاہر ہے کہ
 ریچھ کے جسم میں تو میرا وزیر نہیں رہ سکتا۔ اُسناد کہتا ہے کہ لشکر نے ٹکڑیوں کا ایک
 ڈھیہ جمع کر کے ریچھ کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا۔

کوئی سو برس کے قریب کی عمر کو پہنچ کر بادشاہ (بہادر خان) کی روح ملک
 الموت نے قبض کر لی۔ اے وہاب (شاعر) تو بس اب اللہ کو یاد کئے جا۔
 کہ وفاداری عنتقا ہے۔

کسان کی بیوی اور شہد کی مکھی

اُستاد درودی کہتا ہے کہ ایک کسان کی بیوی گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ کاردار نے، گاؤں کے نمبر دار نے، اُس پر ظلم ڈھلائے تھے۔ انہی مظالم کی وجہ سے کسان کی بیوی گھر چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ گئی۔ جنگل میں پہنچ کر اس کی ملاقات شہد کی مکھی سے ہو گئی۔ شہد کی مکھی یوں گویا ہوئی۔ ”تم گھر سے کیوں بھاگیں؟“

”مجھ پر کاردار اور نمبر دار نے بڑا ظلم کیا ہے۔“ کسان کی بیوی نے کہا۔ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ میں رو رہی ہوں۔ تو میرے دکھوں پر کان دھر لے.....:-

شہد کی مکھی نے کہا :-

اے سہیلی! آؤ اُس کے پاؤں پڑیں، منت سماجت کریں، میں تو جنگل کی ایک معمولی سی مخلوق ہوں۔ شہد کی مکھی، پہاڑوں کی بلندی پر کھلنے والے پھولوں کا رس پوئس کر میں نے اپنے بال بچوں کے لئے شہد تیار کر لیا۔ لیکن بُرا ہو اُس ریکھ کا جس نے اس جنگل میں بھی مجھے دم نہ لینے دیا، شہد کے لالچ میں میری اولاد کو، میرے آشیانے کو اس کم سخت ریکھ نے تباہ کر ڈالا۔ اور میرے معبود تجھے رحم نہ آیا۔

میں تو جنگل کی ایک حقیر مخلوق شہد کی مکھی ہوں.....

یہ داستان بیان کرتے ہوئے شہد کی مکھی نے کسان کی بیوی سے کہا کہ جنگل کے ریچھ نے جب میرا یہ حال کر دیا تو میں نے بھاگ کر ایک کسان کے گھر میں پناہ لی۔ میں نے سوچا تھا کہ اب مجھے راحت ملے گی لیکن اب دیکھ لو کہ کسان میری کیا گت بنائے گا۔ لو سن لو کسان دھر کے سُنو کہ اس کسان نے میرے لئے ایک آرام دہ کمرہ تیار کر لیا۔ دہقان کا یہ گھر میرا سُسرال بن گیا اور اسی بات سے مجھے زیادہ دکھ ہوا کہ ریچھ کے بعد اس کسان نے ایک درستی لے کر میرے شہد کے چھتے کو گھاس کی طرح کاٹ کر لوٹ لیا.....

اپنی پتا سنا کر شہد کی مکھی نے اب کسان کی بیوی سے پوچھا کہ تجھ پر کیا بیتی ہے؟ کسان کی بیوی نے کہا کہ لو پھر سُن لو کہ میرے ساتھ کیا ظلم روا رکھا گیا۔ زندگی تو اسی دُنیا میں گزارنی ہے۔ زمین کے نیچے تو آخر جانا ہی ٹھہرا اور یہ بات مجھے بھی معلوم ہے کہ ہمیں ہمیشہ کے لئے زمین پر نہیں رہنا ہو گا۔

جب بہار کے موسم میں کھیتی باڑی کا موقع آیا تو زمینوں کے مالک (جاگیردار) کسانوں کو بہلانے کے لئے آگئے اور ان سے چکنی چٹری باتیں کرتے رہے۔ لیکن فصلیں تیار ہونے پر پیار محبت کی وہ تمام باتیں بھول کر وہی جاگیردار ہمیں مارنے پیسنے کی غرض سے کھلیانوں میں آدھکے۔ اب تک یہیں تو نہیں رہنا ہو گا..... جو جو بیج میں نے اپنی ماں، زمین کے سینے میں محنت سے بوئے وہ پکی ہوئی فصل کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آگئے۔ لیکن یہ سینکڑوں من اناج جب میں نے کھلیان میں جمع کر لیا تو پٹواری ناپ تول کے لئے آسان سے آفت بن کر ٹپک پڑا۔

اس موقع پر جو بھی عاجز اور مسکین بھکاری میرے کھلیان میں آیا۔ میں نے اپنے دکھ اور اپنی مجبوریوں کو بھلا کر جھولیاں بھر بھر کے اُن محتاجوں میں بانٹ دیں۔ میں

جانتی ہوں کہ یہی نجات کا راستہ ہے یہ ایک ایسی میزان ہے اور اعمال تحریر کرنے
 والا ایک ایسا قلم ہے جس کا توازن ذرا سی اوپنچ نیچ سے بگڑ سکتا ہے۔
 میں تو ایک کسان کی بیوی ہوں، مجھے اب تک یہاں تو نہیں رہنا ہو گا۔ دُنیا
 میں صرف کچھ دن گزارنے ہیں اور اس کے بعد زمین میں سمانا ہے۔ اسی لئے
 تو مجھے زمین سے پیار ہے۔

Handwritten text in Devanagari script, likely a religious or philosophical passage. The text is faint and appears to be a transcription of a manuscript. It consists of several lines of text, with some words being more legible than others. The text is written in a cursive style, typical of handwritten manuscripts from this period.

ایک گیت

- ۱۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، تو سنا جا
ہم یار قند کو فتح کر کے لوٹیں گے۔
- ۲۔ پہلے تو ملکہ وکٹوریہ نے کہا کہ یہ اہم کارنامہ کون سراسجام دے گا؟ فوراً ساتھ
بڑا ہی زور آور ہے یقیناً وہ یار قند پر ہمارا سکہ بٹھا دے گا۔ اور یار قند کا
حکمران ہمیں خراج ادا کرتا رہے گا۔
- ۳۔ ان لوگوں نے لندن سے یار قند کا طویل اور دشوار گزار سفر طے کر کے ہر
طرف شہرت حاصل کی، طے یہ پایا کہ یار قند کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے
سونا مرگ (کشمیر) کی بہار کا لطف اٹھایا جائے۔
- ۴۔ — انگریز حاکموں کی امداد کے سلسلے میں کشمیر کے مہاراجہ کا یہ حکم بلتستان
سے بھی آگے پہنچ گیا کہ انگریزوں کی اس مہم کی اردل میں پہلے تو بلتی آگے
جائیں گے اور ان کے بعد کشمیر ہی۔ یہی پیغام لے کر پیش قدمی کریں گے کہ
ہم یار قند کو فتح کریں گے۔

۵۔ دسونا مرگ میں بہار کا لطف لیتے ہوئے) انگریز حاکموں نے رسد کے سلسلے میں کشمیر کی وادی کے اطراف و اکناف میں مٹادی کی۔ سب سے پہلے مراز پرنہ کی باری آئی اور لوگ چلا اٹھے کہ ہم ناواقف لوگوں کو کس نامعلوم منزل کی طرف ہانکا جائے گا۔

۶۔ بلتستان کے لوگ اردل میں آگے آگے روانہ ہوئے اور ان کے گھروں میں دوسرے مرحلے پر مراز کے کشمیری باشندوں نے قیام کیا۔ گھوڑے تو ڈاک کی سروس میں جُت گئے۔ اور بلتستان کا مقامی جانور زمبا (ZAMBA) گھوڑوں کی خوراک کے لئے گھاس لادنے کے کام آیا۔

۷۔ ادھر وادی میں ملک کے لئے مکڑی اور گھاس جمع کرنے کے کام میں عورتوں کو بھی طلب کر لیا گیا۔ اُن میں کچھ مائیں تو نومولود بچوں کو دودھ پلا دیاں تھیں۔ اور کچھ حاملہ بھی تھیں۔

۸۔ جن دیہاتوں میں صرف مرغیاں دستیاب ہو سکتی تھیں وہاں گھوڑوں کی فراہمی کا مطالبہ کیا گیا۔ اور

جو لوگ ڈھور ڈنگروں کو ہانکنے کی مخصوص آواز سے بھی ناواقف تھے، وہی لوگ ہرے ہرے کہہ کر اُن حیوانوں کو ہانک کر تماشہ بن رہے تھے۔

۹۔ گھوڑے کے زین کا پچھلا حصہ لگام کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا، اور لگام کو گھوڑے کی دُم سے باندھا جا رہا تھا۔ گھاس کی رسیوں سے زمین کو کسا جا رہا تھا اور چیتھرے کا زین گھوڑے کی زینت بن گیا تھا.....

۱۰۔ روٹی کے محتاج لوگوں کو بھی اس جبری بھرتی میں شامل کر لیا گیا.... تاکہ ہر طائفہ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی صورت میں رسد کی مہم کو کامیاب بنائے۔ کمہاؤں کو حکم ملا کہ مٹی کے برتنوں کا انبار لگایا جائے۔

۱۱۔ کمہار کی بیوی نے اپنے میاں سے کہا کہ اے نادان شخص۔ بھٹی کو گرم کرنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے اس افراتفری میں تو کچے برتن بھی بک جائیں گے۔

۱۲۔ گواٹے نے گوانن سے کہا کہ چلو دونوں چلتے ہیں اور کائے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرتے ہیں۔ تم صرف سوکھے گھاس کی ایک گٹھڑی سر پر اٹھائے چلو، اور پھر دیکھو کہ چارے کی قلت کے اس عالم میں کتنی کائیں تمہارے پیچھے دوڑتی نظر آئیں گی۔

۱۳۔ گوالا دودھ کا گھڑا اور دودھ بانٹنے والے برتن ہاتھ میں لئے گھر سے نکلا لوگ سفر کی پیش میں گوالے کو جنت کا دربان سمجھنے لگے۔

۱۴۔ موچی نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ بات میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ جوتے تیار کرنے کا سارا سامان اور چڑا لے کر یہ لوگ مجھے خود بھی اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے رہے ہیں۔

۱۵۔ بیوی نے کہا کہ تو ان سے کہہ دیتا کہ ہمیں یہ سب کام کرنے نہیں آتے۔ موچی نے جواب دیا کہ نیک بخت میں نے یہ تمام باتیں کہی تھیں۔ لیکن وہ نہیں مانتے، ان کا نعرہ تو بس یہ ہے کہ

ہم یار قند فتح کر کے آئیں گے۔

۱۶۔ اب مختلف طاقتوں کے اعداد و شمار جمع کئے گئے۔ لوہاروں کی طلبی ہوئی اور وہ اپنا ساز و سامان سروں پر اٹھائے چلاتے رہے کہ ہم لوگ راستے میں کہاں کو نہ تلاش کرتے پھر میں گے اور بریلے راستے میں کس جگہ اپنی دکان لگائیں گے؟ لیکن گھوڑوں کے نعل تیار کرنے کی بیکاریں لوہاروں کا برا حال ہو گیا۔

۱۷۔ میں (شاعر) اس لحاظ سے بڑا خوش ہوا کہ نامی اور بڑھی کو بھی اس مہم میں پڑ

کر لے گئے اور ان کے گھر والے لٹھے کی چادرزں میں چااول لئے اُن کے پیچھے
بھاگتے رہے کہ کھانے پینے کا کچھ تو سامان ہو۔

۱۸۔ نائی اور بڑھئی کی بیویاں آپس میں مشورے کر رہی تھیں کہ گزارہ کیسے ہو؟۔
آخر یہ طے پایا کہ لوگوں سے اُون اور کپاس لے کر چرخے کا متی رہیں گی اور یوں
زندہ رہنے کے لئے مزدوری مل ہی جائے گی۔

۱۹۔ ابھی صابریلی یہیں تک کہہ پایا تھا کہ صاحب کے آنے کی خبر ملی۔ معلوم ہوا کہ
انگریز صاحب پورے ساز و سامان کے ساتھ اپنی مہم سے واپس آگیا ہے۔

دردستان کے شہزادے

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں بانہال کے پہاڑ پر پنجال پر ایک مرد خوار دھاظاہر ہوا جو سینکڑوں آدمیوں کو کھا گیا۔ اس خوف ناک اژدھے کی وجہ سے لوگوں کے آنے جانے اور تجارت کا یہ واحد راستہ بند ہو گیا۔ ہوتے ہوتے بات دربار تک پہنچی اور کشمیر کے حاکم نے شہر دسری نگر سے ایک فوجی پلیٹن کو سر پنجال کی طرف روانہ کر دیا تاکہ اس بلائے ناگہانی سے لوگوں کو نجات مل سکے۔ لیکن اژدھے کے خلاف شاہی لشکر کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ کیونکہ اژدھا پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسی جگہ رہتا تھا جہاں تک پہنچنے کے لئے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی صرف ایک پگ ٹنڈی موجود تھی اور اژدھے کے منہ سے نکلنے ہوئے زہریلے شعلوں کی وجہ سے چوٹی پر ایک نیلی سی دھند کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو آدمی بھی زرہ بکتر سے بیس ہو کر چوٹی کی طرف جاتا وہ اس نیلی دھند کے حلقے تک پہنچنے سے پہلے ہی زہر کے اثر سے گر کر ہلاک ہو جاتا۔

بادشاہ نے اژدھے کو ہلاک کرنے کے لئے بڑے بڑے انعامات کا اعلان کیا، لیکن

نیل دھند کے حلقے سے کوئی بھی شور مچا رہا نہیں آیا کہ شاہی انعام کا مستحق ٹھہرے۔
 آخر شاہی دربار کے دو دربارستانی مسخروں نے اس مہم کو سر کرنے کی اجازت طلب کی۔
 یہ دونوں بھائی جو دربارستان کے بھوٹے ربلستان یا سنگت کے باشندے تھے اصل میں
 کوئی پیشہ ور مسخرے نہ تھے بلکہ مقدر کے ستارے ہوئے دو شہزادے تھے جنہوں نے اس
 جیلاؤں اور زلزلہ کے علاقوں میں محلاتی سازشوں اور قبائلی نفرتوں کے ایک طویل چکر
 میں اپنی جانیں بچانے کے لئے جلا وطنی کی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ آخر ان دونوں
 بھائیوں نے پریپنجال کے اردھ سے کوہک کرنے کا بیڑا اٹھا کر اپنے مقدر کو آزمانے کا
 عزم کیا۔

دونوں بھائیوں نے کئی روز تک سفر کا سامان اکٹھا کیا۔ لیکن یہ سامان کھانے پینے
 یا سامان جنگ اور گولہ بارود پر مشتمل نہ تھا بلکہ دو چھوٹی تھیلیاں تھیں جو انہوں نے اپنی
 اپنی گردن میں لٹکا رکھی تھیں۔ ان تھیلیوں میں کچھ جڑی بوٹیاں تھیں جن سے کشمیر کے
 لوگ ناواقف تھے، البتہ دونوں تھیلیوں سے پیاز اور لہسن کی خوشبو کو دور سے سونگھا
 جاسکتا تھا۔ ان تھیلیوں کے علاوہ صرف ایک ایک کمان اور کچھ نیزے تھے جو ترکشوں میں
 ڈال کر دونوں بھائی اللہ کا نام لے کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگ ڈھڑی پر چل
 دیئے۔

سادا شکر جانتا تھا کہ نیل دھند کے قریب پہنچ کر یہ دونوں بھائی بھی اپنے پشیروں کی
 طرح اپنا کم زمین پر گر پڑیں گے اور اردھ کی خوراک بن جائیں گے لیکن جوں جوں وہ پہاڑ
 کی چوٹی کے قریب پہنچتے گئے، نیل دھند کا حلقہ بھی کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس دائرے
 میں کچھ شعلے سے بھرتے دکھائی دینے لگے۔

دونوں بھائیوں نے، جن کے منہ اپنی اپنی تھیلیوں میں ڈھکے ہوئے تھے، پوری
 قوت سے دہیر چلائے اور تحلیل ہوتی ہوئی نیل دھند میں ابھرتے ہوئے دونوں شعلے

بُجھ گئے۔

تب دردستان کے ان شہزادوں نے شاہی فوج کو چوٹی کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ چوٹی پر پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مہیب اژدھا لمبے کے ڈھیروں کی طرح مُردہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ دردستان کے شہزادے جادوگر تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی تھیلیوں میں لہسن اور پیاز سے ملتی جلتی کوئی انوکھی جڑی بوٹیاں تھیں، جن سے زہر کی نیلی دھند چھٹ گئی۔ لیکن اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ اژدھے کی دونوں آنکھوں میں جو تیر پوست تھے وہ بہر حال کسی جادو کا کرشمہ نہ تھا۔ بلکہ دردستان کے ان تیر اندازوں کی نشانہ بازی کا کمال تھا۔ ان میں ایک شہزادہ تو وہی تھا جو کشمیر کے ایک درباری رئیس کی خوب صورت لڑکی سے بیاہ کر کے وادی میں سکونت پذیر ہوا۔ اور دوسرے بھائی نے حاکم کشمیر کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ کہتے ہیں کہ اس شہزادے نے کشمیر کی ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی تھی جو مسلمان ہو کر سیتارانی کے بجائے مُسلم بیگم کہلوائی اور سونہ مرگ سے لے کر چھترگل تک کشمیر کا سرحدی علاقہ بادشاہ نے اُسے جہیز کے طور پر دے دیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ بلتستان کی کچھ مسجد (کشمیری مسجد) ہی وہ پہلی مسجد ہے جو اس خاتون کے ہمراہ آنے والے کشمیری مسلمانوں نے اس علاقے میں تعمیر کی تھی۔

نیلی دھند کے حلقے سے کوئی بھی سُورما واپس نہیں آیا کہ شاہی انعام کا مستحق ٹھہرے۔
 آخر شاہی دربار کے دو درستانی مسخروں نے اس مہم کو سر کرنے کی اجازت طلب کی۔
 یہ دونوں بھائی جو درستان کے بھوٹے ربلستان یا گلگت کے باشندے تھے اصل میں
 کوئی پیشہ ور مسخرے نہ تھے بلکہ مقدر کے ستائے ہوئے و دشمن زادے تھے جنہوں نے راس،
 چیلاس اور زلسکار کے علاقوں میں محلاتی سازشوں اور قبائلی نفرتوں کے ایک طویل چکر
 میں اپنی جانیں بچانے کے لئے جلا وطنی کی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ آخر ان دونوں
 بھائیوں نے پیر پنجال کے اژدھے کو ہلاک کرنے کا بیڑہ اٹھا کر اپنے مقدر کو آزمانے کا
 عزم کیا۔

دونوں بھائیوں نے کئی روز تک سفر کا سامان اکٹھا کیا۔ لیکن یہ سامان کھانے پینے
 یا سامان جنگ اور گولہ بارود پر مشتمل نہ تھا بلکہ دو چھوٹی تھیلیاں تھیں جو انہوں نے اپنی
 اپنی گردن میں لٹکا رکھی تھیں۔ ان تھیلیوں میں کچھ جڑی بوٹیاں تھیں جن سے کشمیر کے
 لوگ ناواقف تھے، البتہ دونوں تھیلیوں سے پیاز اور لہسن کی خوشبو کو دور سے سونگھا
 جاسکتا تھا۔ ان تھیلیوں کے علاوہ صرف ایک ایک کمان اور کچھ تیر تھے جو ترکشوں میں
 ڈال کر دونوں بھائی اللہ کا نام لے کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگ ڈنڈی پر چل
 دیئے۔

سارا شکر جانتا تھا کہ نیلی دھند کے قریب پہنچ کر یہ دونوں بھائی بھی اپنے پیٹروں کی
 طرح اچانک زمین پر گر پڑیں گے اور اژدھے کی خوراک بن جائیں گے لیکن جوں جوں وہ پہاڑ
 کی چوٹی کے قریب پہنچتے گئے، نیلی دھند کا حلقہ بھی کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس دائرے
 میں کچھ شعلے سے بھڑکتے دکھائی دینے لگے۔

دونوں بھائیوں نے، جن کے منہ اپنی اپنی تھیلیوں میں ڈھکے ہوئے تھے، پوری
 قوت سے دیر چلائے اور تسخیل ہوئی ہوئی نیلی دھند میں ابھرتے ہوئے دونوں شعلے

بُجھ گئے۔

تب در درستان کے ان شہزادوں نے شاہی فوج کو چوٹی کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ چوٹی پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مہیب اژدھا لمبے کے ڈھیروں کی طرح مُردہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ در درستان کے شہزادے جادو گر تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی تھیلیوں میں لہسن اور پیاز سے ملتی جلتی کوئی انوکھی جڑی بوٹیاں تھیں، جن سے زہر کی نیلی دھند چھٹ گئی۔ لیکن اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ اژدھے کی دونوں آنکھوں میں جو تیرہ پوست تھے وہ بہر حال کسی جادو کا کرشمہ نہ تھا۔ بلکہ در درستان کے ان تیر اندازوں کی نشانہ بازی کا کمال تھا۔ ان میں ایک شہزادہ تو وہی تھا جو کشمیر کے ایک درباری رئیس کی خوب صورت لڑکی سے بیاہ کر کے وادی میں سکونت پذیر ہوا۔ اور دوسرے بھائی نے حاکم کشمیر کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ کہتے ہیں کہ اس شہزادے نے کشمیر کی ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی تھی جو مسلمان ہو کر سیتارانی کے بجائے مُسلم بیگم کہلوائی اور سونہ مرگ سے لے کر چھترگل تک کشمیر کا سرحدی علاقہ بادشاہ نے اُسے جہیز کے طور پر دے دیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ بلستان کی کچھ مسجد (کشمیری مسجد) ہی وہ پہلی مسجد ہے جو اس خاتون کے ہمراہ آنے والے کشمیری مسلمانوں نے اس علاقے میں تعمیر کی تھی۔

Handwritten text in Devanagari script, likely a manuscript or letter. The text is faint and mostly illegible due to fading or bleed-through from the reverse side. It appears to be a continuous paragraph of prose.

کالا پور

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کشمیر کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑی ریاستیں کشمیر کے بادشاہ کو خراج دیتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شیر گڑھی میں مختلف راجاؤں سے آئے ہوئے شہزادے بادشاہ کے دربار میں جمع تھے اور ہر ایک شہزادہ اپنی ریاست کی خوبیاں بیان کر کے بادشاہ کو اپنی راجدھانی کا دورہ کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک پہاڑی ریاست کے شہزادے نے باتوں باتوں میں اُن مختلف راجاؤں کا بھی تذکرہ کیا جو اس کی بہن سے شادی کرنے کی غرض سے اُس ریاست میں آئے لیکن راجکمار کی شرط سے گھبرا کر خالی ہاتھ واپس چلے گئے۔ بادشاہ نے یہ سوچ کر اُس راجکمار کی ریاست میں جانے کی دعوت قبول کر لی اور راجکمار کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا۔

یوں تو اس چھوٹی سی پہاڑی ریاست کے قدرتی مناظر اور شاہی محل سے لے کر کھیتوں میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات تک ہر ایک چیز دل کو لہجاتی تھی لیکن اس علاقے کی ساری خوب صورتی اور اچھائی راجکمار کی روپ میں سما گئی تھی۔ بادشاہ

راجکماری کو دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو گیا اور اُس نے ہر صورت میں شادی کر لینے کی ٹھان لی۔

بادشاہ نے راجکماری کو شادی کی پیش کش کی، تو اُس نے جواب دیا کہ جناب میں تو نہ جانے کب سے اسی خواہش کو اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہوں کہ آپ جیسے بادشاہ کی ملکہ بن جاؤں تاکہ میرا بیٹا آپ کی بیٹی سے شادی کر سکے۔

بادشاہ نے راجکماری کی اس عجیب و غریب خواہش یا شرط کو جیسے سنا ہی نہیں اور اُسے اپنی دلہن بنا کر سری نگر لے گیا۔ نئی دلہن دو چار روز تک بادشاہ کی توجہ کا مرکز بنی رہی، اور اس کے بعد محل میں موجود دوسری رانیوں کی طرح بادشاہ کے ذہن سے اُتر گئی۔ پہاڑی شہزادی کے لئے بادشاہ کا یہ رویہ اور محل کا سنگ ماحول بالکل اجنبی تھا اور وہ کچھ دنوں بعد اپنے میکے واپس چلی گئی۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ اب بادشاہ کی طرف سے بس کوئی نہ کوئی تاحد بلا دے کر آئے گا۔ لیکن نو مہینے اسی انتظار میں گزر گئے۔ اس دوران میں پہاڑی شہزادی نے ایک خوب صورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا جس کا کوئی شایانہ نام رکھنے کے بجائے وہ اُسے کاتے خان کے نام سے پکارتی تھی۔ ننھیال والوں نے اُسے راجکماروں کی طرح پالا پوسا، اور تمام شاہی فنون سکھائے۔ لیکن اُس کی ماں اُسے چوری کا فن سکھانے پر تلی ہوئی تھی۔ پہاڑی شہزادی نے اس کام کے لئے دُور دُور سے عادی اور بدنام چوروں کو بلا کر اپنے بیٹے کا استاد مقرر کیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ”کالے خان“ اس فن میں اتنا طاق ہوا کہ اُس کی ماں پیار سے اُسے ”کالا چور“ کہہ کر پیکار نے لگی۔

ایک دن ماں نے بیٹے کو تنہائی میں بلا کر کہا کہ بیٹا کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ یہ فن میں نے تمہیں کیوں سکھایا؟ بیٹا بولا کہ امی جان یہ بات تو مجھے نہیں معلوم، لیکن اتنی سی بات تو میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ شعر و شاعری، بخت و تمخیص اور نیزہ بازی۔ یا

تیر اندازی کے مقابلے میں مجھے چوری چکاری کے کرتب دکھانے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ یہ باتیں سن کر ماں پھوٹ پھوٹ کر روئی اور کہنے لگی کہ بیٹا میں نے تمہیں یہ فن ایک خاص مقصد کے لئے سکھایا ہے اور وہ ہی مقصد میری زندگی کا حاصل ہے..... بیٹا، ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر خود بھی رو پڑا، اور بولا کہ ماں تو مجھے آسمان کے تارے توڑ کر لانے کا بھی حکم دے تو میں تیری یہ خواہش بھی پوری کر کے دکھاؤں گا۔ لیکن میں تجھے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ماں بولی۔ ”بیٹا تجھ کو یہ تو معلوم ہے کہ تو کشمیر کے بادشاہ کا بیٹا ہے اور تیرے ننھیال والے اُس کے باجگزار ہیں لیکن تجھے شاید یہ نہیں معلوم کہ تیرے باپ نے مجھے بغیر کسی وجہ کے ٹھکرا دیا ہے اور میرا کلیجہ صرف اسی صورت میں ٹھنڈا ہو گا جب تو بادشاہ کو اس حد تک ستائے کہ وہ تجھے اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کرے اور تو اُس رشتے کو حقارت سے ٹھکرا دے۔“

ماں کی یہ داستان سن کر بیٹے نے چپ چاپ رخصت چاہی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کشمیر کے دربار کی طرف روانہ ہوا۔ شاہی محل میں ملازمت حاصل کرنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ سری گنگہ پتے ہی شیر گڑھنی کے شاہی ملازموں میں شامل ہو گیا، اور ہوتے ہوتے بادشاہ کے خاص پہریداروں میں بھر کر ہو کر محافظ اعلیٰ کے عہدے تک جا پہنچا۔

اب ”کالا چور“ ہاتھ کی صفائی دکھانے کے فن کا مظاہرہ کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ پہاڑی شہزادے کی وارداتوں سے دیکھتے ہی دیکھتے پورے شہر میں کھلبلی مچ گئی اور یہ شکاستیں شاہی دربار میں بھی آنے لگیں..... پولیس نے کشمیر کے سارے ہی چوروں کو گرفتار کیا، لیکن چوریوں کی وارداتیں تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔

اب شاہی محل کی باری آئی اور قیمتی چیزیں چوری ہونے لگیں۔ بادشاہ عجیب محض ہیں

گرفتار تھا۔ انتظامیہ کی ساری تدبیریں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ اور عوام بغاوت پر آمادہ ہو رہے تھے۔ آخر بادشاہ نے یہ منادی کروادی کہ جو شخص اصل چور کو گرفتار کرے گا، اُس سے بادشاہ اپنی اکلوتی بیٹی کا بیاہ کر دے گا۔

اس اعلان کے بعد عام دربار لگایا گیا تاکہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس کام کا اہل ثابت کر سکے۔ نب لوگوں نے دیکھا کہ شاہی محافظوں کا سردار سامنے آیا اور بادشاہ سے کہا کہ حضور میں "کالا چور" ہوں اور شہر کی تمام چوریاں میں نے ہی کی ہیں ثبوت کے طور پر اُس نے اُن جگہوں کی نشان دہی کی، جہاں اُس نے چوری کا مال چھپا کر رکھا تھا۔ بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا، اور حسب وعدہ اپنی بیٹی کو "کالے چور" کی دہن بنانا چاہا لیکن کالے چور نے گذارش کی کہ اُسے شادی سے پہلے اپنی ماں کی اجازت درکار ہے جو یہیں کہیں مجمع میں چادر میں منہ چھپائے کھڑی ہے۔ یہ سن کر کالے چور کی ماں ایک چادر اُدھر سے ہوئے کالے چور کی طرف آئی اور اُس کے کان میں کوئی بات کہہ دی۔ کالے چور نے پوری نفرت سے اعلان کیا کہ مجھے بادشاہ کی بیٹی کا رشتہ منظور نہیں، اور میں اس پیشکش کو ٹھکراتا ہوں۔

بادشاہ ندامت سے پانی پانی ہو رہا تھا اور اُس نے نقاب پوش عورت سے کہا کہ بہن تم مجھے گناہوں کی سزا دے رہی ہو، اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے معافی دو، یہ سننے ہی نقاب پوش عورت نے نقاب الٹ کر کہا کہ جہاں پناہ! میں آپ کی بہن نہیں ہوں بلکہ وہ پہاڑی راجکماری ہوں جس سے آپ نے شادی کی درخواست کی تھی۔

بادشاہ اور دربار میں حاضر تمام لوگ حیران ہو کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں اور اُن کے کان اس منظر کو دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی اس پر یقین نہیں کرتے تھے۔ تب پہاڑی شہزادی نے کہا کہ میں کشمیر کی وہ ملکہ ہوں، جسے آپ نے کسی خطا کے بغیر زندگی بھر

جہاں کا دکھ جھیلنے کی سزا دی، اور آج میں آپ کی بیٹی کا رشتہ ٹھکرا کر آپ کو اپنی وہ خواہش یاد دلانا چاہتی ہوں جس کا ذکر میں نے شادی سے پہلے یہ کہہ کر کیا تھا کہ:

"میں آپ جیسے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں تاکہ میرا بیٹا آپ کی بیٹی سے شادی کر سکے۔"

بادشاہ شرمندگی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ پہاڑی ملک کے قدموں پر گرنے لگا لیکن ملک نے جھک کر بادشاہ کو تھام لیا..... اب بادشاہ کی نظریں "سارے چور" کی طرف اٹھیں۔

"پیارے لوگو۔" بادشاہ نے اعلان کیا۔ "آج سے میرا یہ بیٹا تمہارا بادشاہ ہو گا۔ اور لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجا لیں۔"

This is the first book in Urdu devoted to Kashmiri folk tales. We started collection a few years ago. The Institute has undertaken a programme of translation whereby all important oral traditions existing in the regional languages would be offered in Urdu for wider acceptance and appeal. We hope the book will prove useful to scholars and students interested in the study of Pakistani Culture.

۱۳۶

FT-783-0i
C IFH 1978



KASHMIRI FOLK TALES

Chief Editor : Uxi Mufti
Editor : Mazhar-ul-Islam
Research
Translation : Rasool Taus Banehali
Title Design : Farooq Qaiser
Calligraphy : M. Aslam Cheema
First published 1978 by Institute of Folk
Heritage, Islamabad

All rights reserved

No part of this book may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing. For information address Publication Section, Institute of Folk Heritage, P.O. Box No. 1184, Islamabad Pakistan

Printed by Allied Press, 26-The Mall, Lahore

Kashmir Treasures Collection, Srinagar

FT-783-01



کشمیری داستان کو قلم تیری
جہاں سے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں وفات
پائی گیا جاتا ہے اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس
تک پہنچ گئی